مطالعه تاریخ

کوثر نیازی

17848
108/072
00/0111

مُطالعۂ تاریخ

کوثر نیازیؔ

شیخ غلام علی اینڈ سنز، پبلشرز
لاہور ◉ حیدرآباد ◉ کراچی

جُملہ حقوق محفوظ۔

طابع : شیخ نیاز احمد

مطبع : علمی پرنٹنگ پریس، لاہور

بارِ اوّل : اکتوبر ۱۹۷۳ء دو ہزار

بارِ دوم : نومبر ۱۹۷۳ء گیارہ سو

بارِ سوم : جنوری ۱۹۷۵ء ایک ہزار

بارِ چہارم : جولائی ۱۹۷۵ء گیارہ سو

قیمت : نو روپے

مقامِ اشاعت:

شیخ غلام علی اینڈ سنز، پبلشرز

ادبی مارکیٹ، چوک انارکلی، لاہور

۷۲
۲۰۸

مندرجات

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۱	حرفِ آغاز	۵
۲	پیش لفظ (طبع سوم)	۷
۳	عرب مؤرخین کی تحقیق	۱۱
۴	قرآنِ حکیم ۔ تاریخ کی پہلی مستند دستاویز	۱۶
۵	یُونان کے فلسفی بھی عرب تاریخ کا موضوع بنے	۲۳
۶	آریائی اقوام کی تاریخ کا معیار	۲۸
۷	لسانی اِستشہاد اور وید	۳۴
۸	رگ وید، پنجاب اور یہاں کے آباد کاروں کی تہذیب	۳۶
۹	قدیم تاریخِ ہند کے دُوسرے مآخذ	۴۵
۱۰	قرآن کے نزدیک علم تاریخ کی اہمیّت	۴۹
۱۱	قوموں کا عروج و زوال اور تاریخ کا عمل	۵۸
۱۲	ایک خُدا، ایک انسان	۷۳
۱۳	مطالعۂ تاریخ پر اخبارات و مشاہیر کی رائے	۸۳

حرفِ آغاز

چند ماہ ہُوئے، گورنمنٹ کالج لاہور کی ہسٹاریکل سوسائٹی (مجلسِ تاریخ) نے اپنی سالانہ تقریب میں مجھے مہمانِ خصوصی کے طور پر مدعُو کیا۔ اس موقع پر موضوع کی مناسبت سے میں نے تاریخ، اس کے اِرتقاء اور اس کے قرآنی تصوّر کے متعلّق ایک طویل تقریر کی جسے بعض دوستوں نے ٹیپ کر لیا۔

مجھے اپنی بے بضاعتی کا احساس ہے۔ میں اپنے مبلغِ علم کے بارے میں کبھی کسی خوش فہمی کا شکار نہیں ہُوا، لیکن اس دِن میں نے خود محسوس کیا کہ اس تقریر میں مطالعے کا اچھّا خاصا مواد سمٹ آیا ہے۔ بعد میں سامعین میں سے بھی بہت سے اصحاب نے پُرزور اصرار کیا کہ اسے کتابی صُورت میں ضرور شائع ہونا چاہیے۔ چنانچہ قدرے اضافہ اور نظرِ ثانی کے بعد یہ تقریر تحریر کے رُوپ میں پیش کی جا رہی ہے، اگرچہ اب بھی کہیں کہیں اس میں خطابت کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔

کتاب کے دو نکات اہلِ علم کے لیے خاص طور پر دعوتِ تحقیق دیں گے۔ ایک یہ کہ کیا تاریخ آج سے دو چار سو سال پہلے تک محض قصّے کہانیوں اور قیاس آرائیوں تک محدود تھی جیسا کہ بعض نامور انگریز مؤرخین کا دعویٰ ہے؟ اور دُوسرا یہ کہ قرآنِ حکیم کا تصوّرِ تاریخ کیا ہے؟

میں یہ تو نہیں کہتا کہ میری گفتگو اس سلسلے میں حرفِ آخر کا درجہ رکھتی ہے، اس سے فکر و نظر کے کچھ مستور گوشے ضرور بے نقاب ہو کر نگاہوں کے سامنے آجائیں گے۔

اب یہ اہلِ تحقیق کا کام ہے کہ وُہ ان خطوط پر آگے بڑھیں اور مغرب سے مرعوب ہوئے بغیر ریسرچ کی دُنیا میں مشرقی اور اسلامی تصوّراتِ دین و دانش کا پرچم گاڑ دیں

کوثر نیازی

اسلام آباد - ۳۱ اگست ۱۹۷۳ء

پیش لفظ

(طبع سوم)

انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ اسلاف کی تاریخ سے دلچسپی ہو۔ اسی دلچسپی کے باعث ہر دور میں مؤرخین کی کوشش رہی ہے کہ وُہ اپنے دور کے اہم واقعات کو ضبطِ تحریر میں لائیں اور اگلی نسلوں کے لیے محفوظ کر دیں۔ اخلاقی فریضہ تو یہ ہے کہ مؤرخ دیانت داری کے ساتھ واقعات کا صحیح اور متوازن خاکہ اہمیت کے لحاظ سے پیش کر دے۔ اسی طرح ہم تک جدِّ بنی آدم کے جنّت سے سفر کے آغاز سے لیکر اب تک مختلف ادوار کی تاریخ پہنچی ہے۔ اس میں ہم تک تاریخ کا جو سب سے اہم اور مبسوط دستاویزی صحیفہ پہنچا ہے، وُہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا لافانی کلام ہے جس میں نہ صرف واقعات صحّت کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں بلکہ جن واقعات کے بارے میں غلط روایات مصلحتاً یا بعض صورتوں میں عمداً رواج پا گئی تھیں، ان کی تصحیح بھی کی گئی ہے۔

آغازِ اسلام سے ہی خوش قسمتی سے اسلامی مؤرخین نے اس جانب توجّہ دی اور حضورؐ پُرنور کی زندگی کے ہر گوشے، اسلام کی روز افزوں ترقی اور غزوات، ہجرت وغیرہ کے تمام حالات کو ہم تک پُوری صحت کے ساتھ پہنچا دیا۔ یہ تاریخ کا انتہائی عظیم کارنامہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مستشرقین کی مسلسل کدو کاوش کے باوجُود اسلام اور محسنِ انسانیت کے پیغام اور اصولِ حیات و اخلاقیات کے تمام پہلو اسوۂ حسنہ کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہیں۔

مطالعہ صحیح خطوط پر ہو، تحقیقات اصول و انصاف کے ساتھ کی جائے تو تاریخ کے پوشیدہ گوشے بھی واضح ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس میں یہ نکتہ بہر صورت واضح طور پر

ذہن نشین ہونا چاہیے کہ واقعات کی صحّت کا خیال رکھا جاتے اور اس تحقیق کے لیے پوری کاوش کی جائے۔

اسلامی مؤرخین سے پہلے عام طور پر تاریخ سلاطین یا قبائلی سرداروں کے تفاخر کا آئینہ ہُوا کرتی یا پھر واقعات رنگ آمیزی کے ساتھ پیش کیے جاتے۔ عوام یا عوامی جدّوجہد کا ذکر یا تو سرے سے ہوتا ہی نہیں یا پھر ہوتا بھی تو رنگ آمیزی کے لیے۔ اسلام نے اس قدیم ڈگر سے ہٹ کر عوامی رُخ اختیار کیا تو اسکے ساتھ ساتھ اسلامی مؤرخین نے بھی اس جانب توجّہ دی۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں خُلفا یا سلاطین کا ذکر ہوتا ہے، وہیں اسلامی مؤرخین نے عوام کی سوچ اور فکر کے مختلف مکاتیب کی تاریخ بھی محفوظ کر دی ہے۔ اس مواد میں جہاں حکمرانوں کے عدل و انصاف یا کارناموں اور اصلاحات کا تفصیلی تذکرہ ہے وہیں ایسے لوگوں کا بھی پُورا پورا احوال درج ہے جنہوں نے بے باکی کے ساتھ حکمرانوں کو غلط کام کرنے یا صراطِ مستقیم سے ہٹ کر معمولات انجام دینے پر سرِعام ٹوکا اور ہمیشہ اس بات کی کوشش کی کہ اسلامی معاشرہ غلط راہوں پر گامزن نہ ہو۔ ایسے تاریخی مواد سے ہمیشہ اس دَور کے صحیح حالات سامنے آجاتے ہیں جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہُوں، مستشرقین کی ساری غلط بیانیوں اور افسانہ طرازیوں کے باوجُود حقائق منظرِ عام پر آکر ہی رہے۔

اس کتاب میں مندرجہ بالا حقائق کو ہی بطورِ خاص دعوتِ تحقیق کے لیے پیش کیا گیا ہے۔ بعض نامور مغربی مؤرخین اور مستشرقین نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ تاریخ محض قصّے کہانیوں یا قیاس آرائیوں کا مجمُوعہ ہے جس میں اسلاف کے بارے میں من گھڑت یا سُنے سنائے حالات درج کیے گئے ہیں۔ حقیقت یہ نہیں ہے۔ اس لیے میں نے یہ بتلانے کی کوشش کی ہے کہ قرآنِ مجید کا تصوّرِ تاریخ کیا ہے اور اس میں اسلام نے ایمان و ایقان اور قلب و رُوح کا جو زبردست انقلاب برپا کیا ہے اس کا کتنا حصّہ ہے؟

جیسا کہ حرفِ آغاز میں بیان ہوا ہے کہ کتاب اصلاً میری ایک تقریر پر مبنی ہے جو میں نے گورنمنٹ کالج لاہور میں کی تھی۔ مجھے اندازہ نہ تھا کہ اہلِ علم اس کی اتنی پزیرائی کریں گے۔ کالج اور یونیورسٹیوں میں یہ تاریخ کی ایک نصابی کتاب کے طور پر پڑھائی جائے گی۔ اب جب کہ ایک مختصر سے وقت میں اس کے دو ایڈیشن ختم ہو چکے ہیں اور اس کا تیسرا ایڈیشن پیش کیا جا رہا ہے اسمیں چند اضافے بھی کر دیے گئے ہیں۔ دو چار ماہ قبل میں نے پاکستان نیشنل سینٹر سیال کوٹ کی افتتاحی تقریب سے خطاب کیا تھا۔ موضوع گفتگو یہ تھا کہ قوموں کے عروج و زوال میں تاریخ کا عمل کیا ہے۔ یہ تقریر بھی کتاب میں شامل کر دی گئی ہے۔ اِس میں ایک دو مقامات پر قارئین کو "مطالعۂ تاریخ" کے دوسرے نکات کا اعادہ نظر آئے گا۔ خاص طور پر جہاں میں نے سورہ "والعصر" کی تشریح کی ہے، لیکن سیاق و سباق کے لحاظ سے ایسا ضروری تھا۔ ایک گفتگو اسمیں اور بھی شامل ہے جو میں نے دانشوروں کے ایک اجتماع میں کی تھی۔ اس کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ اب تاریخ انسانی دُنیا کو ایسے موڑ پر لے آئی ہے جہاں ایک عالمی حکومت کا قیام وقت کی اہم ضرورت بن چکا ہے۔ موضوع کی مناسبت سے اِس باب کا اضافہ بھی بے محل محسوس نہ ہوگا۔ کیونکہ میرا مطالعۂ تاریخ یہی بتاتا ہے کہ اب انجام کار دنیا کو یہ موڑ مڑنا ہی پڑے گا اور اس کے لیے اسلام کے سوا کوئی دُوسرا مذہب اس کی رہبری نہیں کر سکتا۔

میری یہ کوشش بار آور ہو گی، میری یہ محنت ٹھکانے لگے گی اگر یہ کسی محقق کے کام آجائے اور وُہ اسلام کی خدمت کے جذبے کے تحت دکھی انسانیت کو امن و امان کی نئی زندگی عطا کرنے کی خاطر مزید حقائق پیش کرے اور دُنیا کو بتا دے کہ آج بھی اقوامِ متحدہ کا ادارہ جس امن و امان کے قیام کی کوشش میں ناکام ہے، رنگ و نسل اور قومیتوں کے افتراق کو کم کرنے اور امن و امان کی دُنیا کا تصوّر بھی پیش کرنے کی کوشش میں ابتدائی مدارج میں ہے، وہ منزلیں اسلام نے آج سے صدیوں قبل طے کر لی تھیں۔

کوثر نیازی۔ ۲۸ جنوری ۱۹۷۵ء

۸۲
۴۰۸
17848
108|072
00|0111

عرب مؤرخین کی تحقیق

یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ جب تک اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے نصف اوّل اور نصفِ ثانی میں ماہرینِ آثارِ قدیمہ نے سائنسی بنیادوں پر بنی نوعِ انسان اور اس خطہ ارض کی تاریخ کی جستجو کی طرح نہیں ڈالی تھی اور مختلف غاروں سے برآمد ہونے والے انسان کے مختلف النوع ڈھانچے، اعضا جبڑے اور کھوپڑیاں ان کے ہاتھ نہیں لگی تھیں، اس وقت تک انسانی تاریخ کا ماخذ محض وہ قصّے کہانیاں تھیں جو توریت، زبور، انجیل، رگ وید، یجروید، سام وید، تمروید، مہابھارت، جتکا کہانیوں اور بنی اسرائیل کے علماء کے ذریعے آنے والی نسلوں کے سپرد ہوئیں یا وہ واقعات ہیں جنہیں قرآنِ حکیم نے قابلِ ذکر سمجھا ہے۔

ہمیں مشہور انگریز مؤرخ ایچ جی ویلز کے اس خیال سے اتفاق نہیں ہے کہ دو چار سو سال پہلے تک انسانی تاریخ محض قصّے کہانیوں اور قیاس آرائیوں تک محدود تھی اور مہذب و متمدن دنیا میں عموماً یہ یقین عام تھا اور یہی بات سکھائی اور پڑھائی جاتی تھی کہ انسانی زندگی کا آغاز یکایک چار ہزار چار سو سال قبل مسیح میں ہوا۔[1]

ایچ جی ویلز بڑے اونچے محقق مانے گئے ہیں، مگر انہوں نے جب یہ بات کہی تھی تو ان کی نگاہ صرف زبوری، توریتی اور انجیلی روایات تک محدود رہی تھی یا انہوں نے صرف اس مذہبی ادب و تاریخ کا مطالعہ فرمایا تھا جو زبور، توریت

۱۔ ایچ جی ویلز۔ اے شارٹ ہسٹری آف دی ورلڈ ص ۱۔ مطبوعہ کیسل اینڈ کمپنی۔

اور انجیل کی بنیاد پر لکھی گئی تھی۔

اگر وُہ عربی زبان سے واقف ہوتے یا انہوں نے عرب مؤرّخین اور عرب محدّثین کی تحقیقی جدّوجہد کا بتفصیل جائزہ لیا ہوتا یا ان فرانسیسی اور جرمن انشوروں ہی سے رابطہ قائم کیا ہوتا، جنہوں نے اٹھارہویں صدی اور انیسویں صدی کے دوران عرب مؤرخین مثلاً المسعودی، ابن سعد، ابن ہشام، ابنِ اسحاق، الطبری، ابن اثیر، ابوالفدا اور دُوسرے مصنّفین و مؤرخین کی تصانیف بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کی تھیں تو وُہ کبھی یہ اِدّعا نہ کرتے کہ دو چار سو سال پہلے تک کی انسانی تاریخ محض قیاس آرائیوں اور قصّے کہانیوں پر مبنی تھی۔

ایچ جی ویلز ہی پر کیا موقوف ہے، ایڈورڈ نال برنسز فلپ لی، ہویل اور اس نوع کے دُوسرے انگریز اور امریکی مؤرّخین کا استدلال بھی یہی ہے اور اس کی وجہ اس کے سوا کچھ اور نہیں ہے کہ ان حضراتِ کرام نے اپنے علم کا دائرہ ایچ۔ جی ویلز کی طرح اپنے آس پاس کی تحقیق تک محدود رکھا تھا۔

اگر ان کی نظر کے افق ذرا بھی وسیع ہوتے تو وُہ لازماً دو چار سو سال تک خُود کو محدود نہ رکھتے۔ دو چار سو سال کی مدت کو بڑھا کر چودہ سو سال پیچھے کی سمت ذہنی جست لگاتے اور اس بات کا اعتراف کرتے کہ انسان کی ماضی کی تاریخ کا علم چودہ سو سال پہلے سے قیاس آرائی کی منزل سے نکل چکا تھا اور تحقیق و جستجو کی صحیح راہ پر چل پڑا تھا۔

ہم یہ بات محض ایک مسلمان کے طور پر نہیں کہہ رہے ہیں۔ تاریخ کے اس طالبِ علم کی حیثیت سے کہہ رہے ہیں جس نے انسانی تاریخ کا مطالعہ پہلی صدی ہجری ہی سے نہیں اس وقت سے کیا ہے جبکہ اس زمین کے موجُودہ آدمی کے جدِّ اعلیٰ جنابِ آدم کی تخلیق ہُوئی۔

یقیناً موجودہ آدمی کے جدِ اعلےٰ کی تخلیق کی داستان زبور، توریت اور انجیل میں بھی بیان ہوئی ہے اور قرآن حکیم کو بھی اس سے دلچسپی ہے۔

ایچ جی ویلز اور دُوسرے انگریز اور امریکی مؤرخین کو یقیناً عیسائی ہونے کے اعتبار سے یہ حق پہنچتا ہے کہ وُہ زبور، توریت اور انجیل میں بیان کیے ہوئے تخلیقِ آدم کے قصّوں اور مابعد کے واقعات کو قیاس آرائی کی پیداوار قرار دیں کہ زبور، توریت اور انجیل کی ترتیب و تسوید موجودہ تحقیقی معیار پر پوری نہیں اُترتی اور ان کا روایتی استناد محتاجِ تصدیق ہے۔ ان کتابوں کے راوی مجہُول النّسب بھی ہیں اور مجہُول الحال بھی ان کے پہلے اور دُوسرے، حتیٰ کہ تیسرے اور چوتھے راویوں کا صحیح علم اب تک عیسائی اور یہودی دنیا کو نہیں ہو پایا ہے۔ لیکن قرآنِ حکیم اور پہلی اور دُوسری، تیسری اور مابعد کی صدیوں کے عرب اور مُسلمان مؤرخین کا مقام تحقیق کے ہر معیار پر پُورا اترتا ہے۔ اور قرآنِ حکیم کا پایہ، جو مسلمان مؤرخین کی تاریخ نویسی کی اوّلین اساس ہے، ہر لحاظ اور ہر اعتبار سے قیاس آرائی سے ماوریٰ ہے۔

مسلمان علما ہی کی رُو سے نہیں، تمام عالمی مؤرخین کے نزدیک بھی یہ بات ایک تاریخی حقیقت ہے کہ قرآن کا ایک ایک حرف، ایک ایک لفظ، ایک ایک نقطہ، ایک ایک شوشہ، ایک ایک آیت "الم" سے لے کر "والنّاس" تک اسی ترتیب و تسوید کے ساتھ آج کی دنیا تک پہنچی ہے جس ترتیب کے ساتھ اس کا نزول سنِ ہجری کے آغاز سے بارہ سال پہلے مکّے کے دورانِ قیام میں بعثت کے وقت سے لیکر وصالِ مُبارک تک ہُوا۔

قرآن کا مسئلہ زبور، توریت اور انجیل کا مسئلہ نہیں ہے جو داؤد، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السّلام کی زندگی سے سینکڑوں سال بعد کتابی شکل میں آئیں۔ قرآن پاک جس وجودِ پاک پر اترا خُود اس نے اپنی حیاتِ طیبہ میں نزول کی ساعتوں میں اسے لکھوایا بھی اور اسے محفوظ بھی رکھا[1]

---

[1] الفہرست، ابن الندیم۔ ص ۱۴-۱۵، ابن کثیر جز ۵-ص ۸۵۔

ہمارے علمائے تاریخ و تفسیر و حدیث نے اس موضوع پر بے شمار کتابیں تصنیف کی ہیں اور یہ کتابیں پایہ اِستناد کے اعتبار سے بڑے بڑے جرمن اور فرانسیسی حتیٰ کہ انگریز مستشرقین کے نزدیک حد درجہ دقیع ہیں - یہ کتابیں تاریخی معیار پر ہر طرح پوری اترتی ہیں - اور ان کی رُو سے جیسے جیسے قرآن اترتا جاتا ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم اسے چمڑے کے ٹکڑوں ، صاف و شفاف ہڈیوں ، حتیٰ کہ کھجور کے چوڑے چکلے پتوں پر لکھواتے جاتے تھے اور اُسے محفوظ کر لیتے تھے [1]

محض یہی نہیں ہوتا ، صحابہ کرام رضی کی ایک بڑی جماعت اسے ساتھ ساتھ حفظ کرتی جاتی تھی - ابنِ کثیر ، ابنِ اثیر ، الطبری ، البخاری ، المسلم ، ابن قتیبہ ، المدائن اور ابن الندیم صاحبُ الفہرست نے ایسے صحابہ رضی کی تعداد چودہ سو بیان کی ہے جنہیں قرآن کا لفظ لفظ اور سُورہ سُورہ حفظ تھی اور حُفّاظِ قرآن کی یہ تعداد ابنِ کثیر ، الطبری ابنِ اثیر اور ابنِ خلدون کی رُو سے صرف جنگ الیمامہ میں کم ہوئی تھی - اس جنگ میں چودہ سو حفّاظ جامِ شہادت نوش فرما گئے تھے [2]

الطبری نے بھی ، البخاری نے بھی اور ابن کثیر اور ابن الندیم نے بھی یہ رُوداد لکھنے کے بعد محاکمہ کیا ہے کہ جب اُن حفّاظ کی شہادت کا علم جناب ابوبکر رضی اور جناب عمرِ فاروق رضی کو ہوا تو انہیں تشویش لاحق ہوئی کہ کہیں اسلام کی سربلندی کے لیے لڑی جانے والی اگلی لڑائیوں میں حفّاظِ قرآن کی ساری جماعت شہادت نہ پا جائے اور قرآن کے یہ راوی معدوم نہ ہو جائیں - انہوں نے ایک بورڈ کُتّابِ وحی کا قائم کر کے وُہ تختیاں ، ہڈیاں اور چمڑے کے وُہ ٹکڑے جو حضور نے محفوظ کر رکھے تھے جنابِ زید رضی بن ثابت جیسے معتمد کاتبِ وحی کے سپرد کیے اور ان کو حکم دیا کہ حفّاظ

---

[1] ایضاً بحوالہ سابق

[2] ابن اثیر جز ۳ ص ۱۴۱ - ابن خلدون جز ۲ ، تتمہ ص ۵۸ - ابنِ کثیر جز ۵ - جنگ الیمامہ

کی مدد سے کتابِ الٰہی کی باقاعدہ تسوید و ترتیب کا فریضہ انجام دیں۔

بزرگ مؤرخین نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ پوری جستجو، پوری تحقیق اور حد درجہ احتیاط کے ساتھ جو نسخہ مرتب ہوا اسے جنابِ ابوبکر صدیقؓ نے ریاست کی سب سے قیمتی متاع ٹھہرا کر محفوظ فرما لیا۔

حضرت ابوبکرؓ کی وفات کے بعد جنابِ عمر فاروقؓ نے جب خلافت سنبھالی تو انہوں نے از سرِ نو اس متاعِ گرامی کا جائزہ لیا، اس کی نقلیں تیار کرائیں اور انہیں ریاست کے مختلف علاقوں میں بھجوا دیا۔

حضرت عثمانؓ خلیفۂ ثالث کے زمانے میں اس پر مزید محنت ہوئی[1]۔

---

[1] ابن الندیم، الفہرست نسخہ قدیم ص ۱۴۔ ۴۴۔ ابن کثیر جزء ۵۔ ص ۸۲۔ ۴۴۔

تاریخ کی پہلی مستند دستاویز

ہمارا موضوع اس محنت کی تفصیل بیان کرنا نہیں ہے۔ ہم صرف یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ قرآنِ کریم جو اسلامی تاریخ کا اوّلین محرک ہے یا جیسے تاریخِ اسلام کا حرفِ اوّل کہا جا سکتا ہے، تاریخِ بنی نوعِ انسان کی ایسی دستاویز ہے جو ایچ جی ویلز اور دُوسرے مغربی مؤرخین کو یہ کہنے کے قابل نہیں رکھتی ہے کہ انسانی تاریخ کا علم صرف دو چار سو سال پہلے وثوق کی منزل میں داخل ہُوا ہے۔

یہ علم اسی وقت وثوق و یقین کی منزل میں داخل ہو چُکا تھا جبکہ قرآنِ محمدِ عربی صلّی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہُوا اور اس نے حیاتِ انسانی کی فلاح و بہبود کے لیے مکمل دستور پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ماقبل دور کی جزواً نقاب کشائی کی تھی اور بعض پچھلی بڑی قوموں اور بعض پچھلی بڑی شخصیتوں، ملّتوں اور انبیا کے حالات کا ذکر کیا تھا اور یہ ذکر ہرگز ہرگز قیاسی و خیالی ذکر نہیں ہے۔

یہ انسان کی تحریری تاریخ کی سب سے پہلی مستند دستاویز ہے اور اس دستاویز کو کسی اعتبار سے بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

گو ہم اُن علمائے تاریخ سے پوری طرح متفق نہیں ہیں جن کا عقیدہ ہے کہ قرآن حکیم نے چونکہ بعض پہلی اُمتوں، بعض پہلے انبیاء اور بعض پہلے اَدوار کے قصص بیان فرماتے ہیں اس لیے قرآنِ حکیم ہی نے پہلے عرب مؤرخین امام شعبیؒ، امام مالکؒ، امام ابن اسحاقؒ، ابن ہشامؒ، ابن سعدؒ حتیٰ کہ امام الواقدی، امام البخاریؒ، امام المدائنیؒ، ابو عبیدؒ، امام مسلمؒ، ترمذیؒ، نسائیؒ، ابن ماجہؒ، الطبری، ابن الندیم، البلاذری، ابن اثیر، ابن کثیر، ابنِ خلدون، ابو الفدا، السہیلی، الخزائطی اور دُوسرے علماء کو کلّیتاً تاریخ نویسی پر متوجہ کیا تھا۔

ہمارے نزدیک قرآنِ حکیم اسلامی تاریخ کی اوّلین اساس تو یقیناً تھا۔ وہ ایک مضبوط

محرّک بھی قرار دیا جا سکتا ہے، مگر عرب مؤرخین اور علمائے حدیث نے تاریخ نویسی اور حدیث کی تسوید کا کام عموماً اپنے ذمّے اس لیے لیا تھا کہ وہ اسلامی یعنی قرآنی تعلیمات اور حضور سرورِ کون و مکان صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سیرتِ طیّبہ و اُسوۂ حسنہ اور خلفائے راشدینؓ کے طریقِ کار سے پھوٹنے والی روشنی کو آنے والی نسلوں کے سینوں تک پہنچانا چاہتے تھے۔

البتہ یہ سو فیصد صحیح ہے کہ اسلامی تاریخ کے بڑے ستون ابنِ سعد نے اپنی مشہورِ عالم تصنیف "طبقات" کے پہلے جُزو اور اس کے بعد المسعودی، الطبری، ابن اثیر، ابن کثیر اور ابنِ خلدون اور دُوسروں نے اپنی تصانیف کی پہلی جلدیں تخلیقِ آدم سے جب شروع کیں تو ان کے ذہن اس الہامی اذکار سے متاثر تھے جو قرآن نے پہلی اُمتوں کے متعلق کیا تھا۔

خصوصاً مؤرخ المسعودی جو سارے مستشرقین اور بڑے بڑے جرمن اور فرانسیسی سکالروں کے نزدیک تاریخ کا پہلا بڑا محقّق کھوجی ہے ان اقوام و ملل کے ٹھکانوں کی تلاش میں صنعا، حضرموت، وادی الحجاز، مصر اور فارس حتیٰ کہ ہندوستان تک جا پہنچا تھا اور جو کام تحقیقِ آثارِ قدیمہ کا انگریز، جرمن اور فرانسیسی محققین نے اُنیسویں صدی میں شروع کیا اسے اس نے تین سو تنتیس ہجری تک قریب قریب اپنے نقطۂ عروج سے مکمل کر لیا تھا۔

ایچ جی ویلز اور دُوسرے انگریز مؤرخین نے نہ تو المسعودی کو پڑھا ہے نہ ابنِ سعد اور الطبری اور دُوسری عرب تاریخوں ہی کا مطالعہ کیا ہے ورنہ انھیں علم ہوتا کہ عرب مؤرخین نے انسانی تاریخ کی جو جستجو دُوسری صدی ہجری سے شروع کر دی تھی وہ تاریخ نویسی کی بڑی ہی ٹھوس اساس ہے۔

ان عرب مؤرخین نے خصوصاً ابن سعد، المسعودی، الطبری، ابن کثیر اور ابنِ اثیر نے، تاریخِ بنی نوعِ انسان رقم کرتے وقت یقیناً ان روایات پر بھروسہ کیا ہے جو

بنی اسرائیل کے علما سے ان تک پہنچی تھیں مگر ان روایات کی انہوں نے خوب چھان پھٹک کی تھی اور ہر اس علمی آستانے پر دستک دی تھی جہاں سے انہیں کوئی بھی بات معلوم ہو سکتی تھی ۔ یہی وجہ تھی کہ انہیں پوری تحقیق و جستجو کے بعد جو علم حاصل ہُوا، اُسے اُنہوں نے بڑے اعتماد اور بڑے وثوق کے ساتھ قلم بند کر دیا اور اس طرح صفحۂ قرطاس پر اس کی عکاسی کی جیسے وُہ ہر واقعے اور ہر حادثے کے عینی شاہد تھے ۔

تفصیل کا موقع نہیں ہے ۔ مثلاً المسعودی کا یہ اندازِ بیان ملاحظہ فرمایئے :

ثم سار امیم بن لاوُزر بن سام بن نوح علیہ السلام بعد جرھم بن قحطان فحل بارض فارس الفرس من ولد کیومرث بن امیم بن لاوُزر و انّ امیم اوّل من ابتن البنیان و رفع الحیطان و قطع الاشجار و سقف السقوف [1]

(یعنی پھر لاوُزر بن سام بن نوح کے بیٹے امیم، جرہم بن قحطان کے بعد اپنے اصل کارواں سے جُدا ہُوئے اور ارضِ فارس میں جا اترے ۔ پس فرس کیومرث بن امیم کی اولاد ہیں اور امیم ہی وُہ ہیں جنہوں نے پہلے پہل عمارتیں بنانا شروع کیں، جنہوں نے دیواریں اُٹھائیں اور چھتیں ڈالیں ۔)

قریب قریب یہی بیان الطبری، ابن سعد اور ابوالفدا اور مابعد کے مؤرخین کا ہے [2] اس سے ذرا آگے چل کر المسعودی ایک اَور دعویٰ پُورے وثوق کے ساتھ کرتے ہیں ۔

وقد ذکر جماعۃٌ من اھل السیر و الاخبار ان جمیع ما ذکرنا من ھذہٖ القبائل کانوا اھل خیمٍ و بدوٍ [3]

---

[1] المسعودی مروج الذہب جز ۲ ص ۱۴۲ ۔

[2] ابن سعد جز اوّل ۔ ص ۱۹ ۔ ابوالفدا ص ۵۹ ۔ الطبری جز اوّل ص ۱۰۵ ۔ ۱۲۷ ۔

[3] المسعودی ۔ جز ا ص ۱۴۴ ۔

(یعنی اہل سیر میں سے ایک جماعت کا بیان ہے کہ جن قبائل کا ہم ذکر کر چکے ہیں یہ سارے کے سارے خیموں میں رہنے والے بدو اور گڈریے تھے۔)

ڈاکٹر سچریڈر، ایچ جی ویلز سے کہیں بڑے محقق اور ماہرِ آثارِ قدیمہ مانے گئے ہیں۔ انہوں نے اپنی مشہورِ عالم کتاب "پری ہسٹارک انٹی کیوٹیز" ۱۸۹۰ء میں تصنیف کی تھی۔ وہ "گرِم" جیسے بڑے استاذِ تاریخ و ماہرِ آثارِ قدیمہ کے مدرسۂ فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ ڈاکٹر سچریڈر مسعودی ایسے وثوق ہی کے ساتھ کہتے ہیں:

On the whole, Grimm is of the opinion that the Indo Europeans, when they moved from Asia to Europe, were still Shepherds

(بہرحال گرِم کا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ انڈو یورپین جب ایشیا سے یورپ کی طرف بڑھے تو وہ ابھی گڈریے تھے۔)[1]

ہم نہیں کہہ سکتے کہ ایچ جی ویلز کے نزدیک گرِم اور سچریڈر کا کیا مقام تھا۔ مگر تمام علمائے تاریخ نے انہیں استادوں کا اُستاد مانا ہے اور استادوں کے یہ اُستاد اس تحقیق کی تصدیق کرتے ہیں جو المسعودی اور ابنِ سعد اور البطری نے تیسری صدی ہجری تک کی تھی۔

ہم نے یہ صرف ایک مثال پیش کی ہے ورنہ ابنِ سعد اور المسعودی، البطری ابوالفدا اور دُوسرے عرب مؤرخین نے جن روایات کو سند قرار دے کر اپنے وثوق اور یقین کی عمارت کھڑی کی تھی، اُسے انیسویں صدی کے محققین نے بڑی حد تک صحیح پایا ہے ایچ جی ویلز تک ہماری رسائی نہیں ہے، نہ الفنسٹن یا دُوسرے انگریز مؤرخین

---

[1] پری ہسٹارک انٹی کیوٹیز ص ۱۳۔ گرِم ص ۱۵-۱۸-۶۸-۶۹

کا دامن ہماری دسترس میں ہے ورنہ ہم ان سے کہتے کہ آپ جن باتوں کو قیاس قرار دیتے ہیں اُنہیں ابنِ سعد، المسعودی اور ان کے بعد آنے والوں نے محقّقات کی حیثیت دی ہے۔

بلاشبہ ان کے اکثر بیانات کی بنا روایت تھی تاہم انہوں نے اس روایت کو بڑے تواتُر سے سنا اور پھر پورے وثوق سے قلم بند کیا تھا۔ ایک مثال ابنِ سعد کے وثوق کی بھی ملاحظہ فرمائیے۔ وُہ کہتا ہے :

"بابل ماضی بعید میں انسانی تمدّن کا سب سے بڑا گہوارہ تھا اور یہ وُہ اوّلین مقام تھا جسے حضرت نوح علیہ السّلام کے ایک بیٹے یوناطن نے طوفانِ نوح کے تھم جانے کے بعد آباد کیا تھا۔ یوناطن اور ان کے بھائی سام بن نوح ایک ساتھ رہتے تھے بابل کی آبادی کے بعد سام شام کی طرف چل پڑے اور مُلک شام ان ہی سے موسوم ہُوا۔"[1]

المسعودی نے اسی وثوق کے ساتھ یہ دعوٰی کیا ہے کہ بیصر جو ارم کی اولاد میں سے تھا، مصر کا بانی ہے اور یہ بات نئی تحقیق سے ثابت ہو گئی ہے[2]

ہم بات کو لمبا نہیں کریں گے۔ البتّہ یہ ضرور کہیں گے کہ عرب مؤرخین نے جن حقائق کو روایت کے ذریعے ہم تک پہنچایا ہے، ان میں سے سب سے بڑی حقیقت حضرت نوح علیہ السلام کے وجُود اور ان سے منسوب طوفان کی ہے۔

یہ حقیقت اگر داستان اور محض قیاس آرائی تھی تو یہ قیاس عرب مؤرخین کی تحریروں کے علاوہ ہندوستان کی قدیم مذہبی کتابوں میں ایک متواتر اور مسلسل دُہرائی جانے والی روایت کیوں بنا اور رائے وبّر جیسے جیّد فاضل اور غیر معمولی محقّق نے یہ استشہاد کیوں کیا کہ آریہ قوم کے جدِّ اعلےٰ منُو مہاراج حضرت نوح علیہ السّلام سے

---

[1] ابن سعد جزا اوّل ص ۱۸ [2] المسعودی جز ۲ ص ۱۴۲

ملتے جلتے وجود کے تھے کیونکہ کیتھ پاتھا برہمنا میں جو رگ وید کی تشریح ہے، ایک کہانی بیان کی گئی ہے کہ منو مہاراج کو ایک مچھلی نے اطلاع دی کہ ایک خطرناک سیلاب آنے کو ہے، کشتی تیار کرلیں اور سیلاب کے وقت اس کشتی میں سوار ہوجائیں۔

سیلاب اژدہے کی طرح پھنکارتا ہوا آن پہنچا۔ پھر ہر شئے زیر و زبر ہوگئی۔ منو مہاراج جلدی سے کشتی میں سوار ہوگئے۔ سیلاب اس قدر منہ زور تھا کہ اس نے ہر بلندی کو چھو لیا اور منو مہاراج کی کشتی ہمالیہ کی اونچی سے اونچی چوٹی پر چڑھ گئی۔[1]

فاضل اے دبرؔ نے "کیتھ پاتھا برہمنا" سے جو کہانی نقل کی ہے، ویسی ہی کہانی عرب تاریخ میں بڑے تسلسل اور تواتر کے ساتھ موجود ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ کیتھ پاتھا برہمنا کی اس کہانی میں منو مہاراج مرکزی نقطہ ہیں اور عرب روایات میں منو کی جگہ جناب نوح علیہ السلام اصل شئے ہیں۔ (یہ موقع نہیں ورنہ ہم منو اور نوح کی صوتی مناسبت سے استدلال کا یہ زاویہ بھی سامنے لاتے کہ کہیں یہ دونوں ایک ہی شخصیت تو نہیں؟) عرب روایات کے مطابق سیلاب نے جب خطرناک شکل اختیار کرلی تھی تو حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی موصل کی ایک پہاڑی جودی پر ٹھہر گئی تھی اور سیلاب اتر جانے کے بعد جنابِ نوح علیہ السلام جودی کے دامن میں کچھ دیر رک کر بابل کی طرف آگئے۔

قریب قریب یہی روایت بنی اسرائیل، ترک، کرد اور ایرانی قصوں کا موضوع ہے۔ اور ہم سمجھتے ہیں کہ جب کسی قصے کہانی کو عالمی نوع کا تواتر و تسلسل حاصل ہوجاتا ہے تو قیاس کی حدیں سمٹ جاتی ہیں۔

یوں بھی اگر تاریخ بنی نوع انسان کو دو چار سو سال قبل محض قیاسات کی پیداوار

---

[1] اے دبرؔ۔ سٹڈیز جلد اوّل ۱۶۱

ٹھہرایا جائے گا تو علمِ تاریخ کی ساری عمارت دفعتہً زمین پر آن گرے گی' جسے عرب مؤرخین نے آسمانوں ایسی رفعت بخش دی تھی اور اسلامی عروج کے دنوں میں ان میں سے بعض مثلاً المقدسی ، ابن جبیر ، الاصطخری ، الادریسی ، ابن قتیبہ ، ابنِ بطوطہ المسعودی ، الفرائض ، ابن الفقیہہ ، البیرونی ، المقریزی اور الیاقوت الحموی نے ایک سائنسی علم بنا دیا تھا اور اکنافِ عالم کو اپنے پائے تحقیق کے نیچے بچھا کر زمین و آسمان کی طنابیں کھینچ لی تھیں۔

یُونان کے فلسفی بھی عربؑ تاریخ کا موضوع بنے

مؤرخ ابن الندیم صاحبُ الفہرست کا یہ دعویٰ تو قطعاً غلط نہیں ہے کہ یہ عبّاسی خلیفہ مامون الرشید اور اس کے عہد کے عرب مؤرخین اور عرب عالم ہی تھے جنہوں نے یُونان کی حکمتِ گم گشتہ یا گرجوں کے تہ خانوں میں مدفون یُونانی علوم وفنون کو سونے کے بھاؤ خریدا تھا۔ مامون الرشید نے کئی جہاز سونے سے بھر کر رومی اور یونانی ساحلوں پر بھجوائے۔ مامون الرشید کے دلالوں نے رومی اور یُونانی گرجوں کے لاٹ پادریوں سے ان کے تہ خانوں میں مدفون کرم خوردہ کتابوں کے انبار کے انبار ترازو کے ایک پلڑے میں رکھوائے، دُوسرے میں سونا ڈالا اور یوں منوں بوجھل یہ علمی ذخیرے روم اور یُونان سے بغداد لائے اور پھر ان کی "ایڈیٹنگ" بھی کی اور ان کی ٹرانسلیشن بھی۔ اور جن لوگوں نے انہیں ایڈٹ کیا اور ترجمہ کر کے عربی میں ڈھالا انہیں فی کس ماہانہ اسّی اشرفیاں یا اسّی پونڈ سونے کی شکل میں، کاغذ کی صورت میں نہیں، عطا کیے[1]

اِس کے معنی یہ ہُوئے کہ تیسری صدی ہجری میں مُسلمان علما اور مُسلمان مؤرخین اس قابل بھی ہو گئے تھے کہ نہ صرف اپنے علُوم وفنون، اپنی واجبُ الاحترام شخصیتوں، اپنی اجتماعی، معاشی اور سیاسی زندگی کے نمایاں خدّوخال کو تاریخ کے سانچے میں ڈھال دیں بلکہ یُونانی اور رُومی فلسفیوں کے افکارِ عالیہ، فنونِ

---

[1] الفہرست۔ ابن الندیم۔ نسخہ قدیم ۱۶-۴۱۔

دلچسپ اور علمی تحقیقات اور شخصیات کے احوال اور کوائف کو بھی ضبطِ تحریر میں لے آئیں۔

یُوں ایچ جی ویلز، ایلفنسٹن، ہویل اور دُوسرے انگریز اور امریکی مؤرخین کے لیے شاید یہ بات نئی ہو، عرب مورخین نے تحقیق کا دامن پانچ سو قبل مسیح تک پھیلا دیا تھا اور سقراط، افلاطون اور جالینوس کے خیالات بھی منضبط کر دیے تھے، ان کی شخصیتوں کو بھی تعارف بخش دیا تھا۔

مغربی علما اور مفکّرین اس بات کو مانیں یا نہ مانیں، یہ خلیفہ مامون الرشید اور اس کے دَور کے علما اور فضلا تھے جنہوں نے یُونانی حکمت کے ساتھ یُونانی حکیموں سے پُورے عالم کو آگاہ کیا تھا۔ یہ وقت اس بحث کا نہیں ہے کہ مُسلمان علما کی محفلوں میں کوئی ایک ہزار سال تک یونانی حُکما موضوعِ بحث رہے ہیں۔

بلاشبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کی علمی تاریخ کا موضوع بننے والے یُونانی فلسفیوں کے خدوخال کی عکاسی اس انداز میں نہیں کی گئی جس انداز میں مسلمان مؤرخین نے اپنی بڑی شخصیتوں اور اپنے واجب الاحترام وجودوں کی کی۔ مگر یہ قدرتی امر تھا اور یہ قدرتی امر مسلمان مؤرخین ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، انگریز، امریکی اور دورِ حاضر اور ماضیِ قریب کے تمام دُوسرے مغربی مؤرخین کا بھی خاصّہ رہا ہے۔ ہمیں تو سوائے چند جرمن اور فرانسیسی اور دو ایک انگریز مؤرخوں کے کسی اور کا نام معلوم نہیں ہے جس نے اپنی قومی شخصیّتوں کی نسبت غیر قومی یا غیر مُلکی شخصیّتوں پر زیادہ توجّہ کی ہو۔

بہرحال یہ حقیقت ایک بڑی ٹھوس حقیقت ہے کہ عرب مؤرخین کی تاریخی تالیفات حد درجہ معیاری اور انتہائی مستند ہیں اور ان میں مندرج روایات کا پایۂ استناد بہت اُونچا ہے۔

انگریز اور امریکی مؤرخین کو شاید یہ معلوم نہ ہو کہ ہمارے پہلے مؤرخین نے تاریخ

نویسی میں کم و بیش وہی اہتمام برتا تھا جو حدیثِ نبوی کی روایات کے سلسلے میں ملحوظ رکھا۔

انہوں نے نفسِ مضمون اور متن کی چھان پھٹک بھی کی اور متن جن راویوں کے ذریعے ان تک پہنچا ان کی شناخت خود سے کی اور دُوسروں سے بھی کرائی اور اس طرح تاریخ نویسی کو سند کے اعتبار سے حدیث کے قریب تر کر دیا۔

بلا شُبہ حدیث کی چھان پھٹک کرنے والے محدّثین کا گروہ نسبتاً بہت زیادہ محتاط تھا۔ کیونکہ حدیث کا موضوع جو ذاتِ پاک تھی وُہ عام شخصیتوں سے ماورا تھی اور مُحدّثین نے یہ گوارا نہ کیا کہ حضورؐ کے قول و فعل کو اگلی نسلوں تک پہنچانے میں ذرّہ برابر بھی تساہُل برتیں۔

اور ہم تو ان محدّثینِ کرام کی احتیاط کی بنا پر یہ تک کہنے پر قادر ہیں کہ جہاں تک حضورؐ کی سیرت، حضورؐ کے زمانے کے تاریخی واقعات و حالات کا تعلق ہے اُن پر کسی قیاس آرائی کا گمان نہیں کیا جا سکتا۔ وُہ بالکل نئی سائنسی اقدارِ تاریخ نویسی پر نقطہ بہ نقطہ اور شوشہ بہ شوشہ پُورے اُترتے ہیں۔

اس لیے ہمارے نزدیک اسلام کے دورِ اوّل، خصوصیت سے حضورؐ کے عہد اور خلفائے راشدینؓ کے عہد کی تاریخ، انتہائی ٹھوس، پاک اور منزّہ اساس پر قائم ہے اور اس پر قطعاً کوئی شبہ وارد نہیں کیا جا سکتا۔

اس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ اس عہدِ اوّل کو محدّثین نے بھی موضوع بنایا ہے اور مؤرخین نے بھی اور اس کثرت اور اس تواتُر و تسلسل کے ساتھ اس پر لکھا ہے کہ دُنیا کی کسی قوم کی تاریخ پر اتنا نہیں لکھا گیا ہے۔

ابن الندیم تیسری صدی ہجری کے تذکرہ نگار ہیں۔ انہوں نے جب اپنا یہ تذکرہ لکھا تو اسلام کے عہدِ اوّل سے متعلق تالیفات کئی سو کی تعداد سے بھی بڑھ گئی تھیں[1] اور

---

[1] الفہرست۔ ابن الندیم ۱۱ سے ۶۷ صفحات تک

عباسی دَور میں تو ایک ایسا مرحلہ بھی آیا تھا کہ عہدِ اوّل کے حالات پر کئی ہزار تالیفات کے ڈھیر کے ڈھیر ہر سُو لگ گئے تھے اور کوئی بھی عالم شاذو نادر ہی ایسا تھا جس نے عہدِ اوّل کی تاریخ پر قلم نہ اُٹھایا ہو۔

عہدِ عبّاسی کی طرح اُندلسی دَور نے بھی اس باب میں بڑی ناموری پائی ہے۔ الحکم اُموی خُلفا کا وُہ آخری خلیفہ ہے جس پر اُموی عہد کا دَور ختم ہوتا ہے۔ اس الحکم کی لائبریری میں کم وبیش پانچ لاکھ قلمی کتابیں جمع تھیں[1] جن میں سے تاریخِ حدیث کی کتابیں پچاس ہزار تھیں۔ الحکم کے بعد بھی تاریخ کے موضوع پر سینکڑوں اور کتابیں لکھی گئیں۔ ہم اُن کا احاطہ نہیں کریں گے۔

ہم نے یہ تذکرہ بھی محض اس لیے کیا ہے کہ انگریز اور امریکی مؤرخین و محقّقین پر یہ واضح کر سکیں کہ اسلام کے چودہ سو سالہ دَور کی تاریخ قیاسی نہیں، واقعاتی ہے۔

اور پھر یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ خلافت کے بعد ملوکیّت اور خاندانی بادشاہوں کے جو ادوار ملّی تاریخ کا جزو بنے ہیں ان کی تفصیلات کو موضوع بنانے والے مؤرخین کی بھی کوئی کمی نہیں ہے۔

بنو اُمیّہ پہلی بادشاہت ہے، جو خلافتِ راشدہ کے بعد قائم ہوئی تھی۔ اس بادشاہت کے عہد کی لکھی ہوئی تاریخیں بھی تاریخی معیار پر پُوری اُترتی ہیں خصوصیّت سے مؤرّخ ابن عساکر کی تاریخِ دمشق، جس کے پہلے چار اجزا چھپ چکے ہیں اور باقی سولہ اجزا دمشق کے مکتبہ الظاہریہ میں بڑے اہتمام کے ساتھ محفوظ ہیں، بنو اُمیّہ کے حالات کا ایک ایسا محاکمہ ہے، جسے ہزاروں تحقیقی کسوٹیوں پر بھی پرکھا جائے تو ہیٹا ثابت نہیں ہوگا۔

ابنِ قتیبہ، ابنِ جبیر، ابن الفقیہہ، المقریزی، المقدسی، السیوطی، ابن الجوزی ابن عبدالحکم، المسعودی، الطبری اور الدنیوری نے بھی اس دور کو بڑی توجہ سے اپنا

---

[1] نفح الطیب، جُزاوّل۔ ص ۵۱۔ نیز جُز ۲۔ ص ۸۲

موضوع بنایا ہے اور پھر ہمارے مشہور مورخین الطبری ، ابن اثیر ، ابن خلدون اور ابن کثیر نے بھی مسلمان حکومتوں کے ذکر میں جہاں اس وقت کی ساری بادشاہوں کے حالات قلم بند کیے ہیں ، بنو امیہ پر بھی سیرِ حاصل روشنی ڈالی ہے ۔

ابنِ خلکان نے اور امام ابو الفرح الاصفہانی نے اپنی کتاب الاغانی میں بھی بنو اُمیہ کے دور کی بڑی شخصیتوں کو خاصی اہمیت دی ہے ۔

الطبری چوتھی ہجری کے مؤرخ تھے ۔ وہ اپنے عہد تک محدود رہے ۔ ان سے جو کسر باقی رہ گئی تھی اسے الحلۃ الطبری نامی کتاب میں پورا کر دیا گیا ہے اور پھر بنو عباس ، پھر آلِ بویہ ، زنگی خاندان ، ایوبی خاندان ، سلجوقی خاندان ، عثمانی ، ترکوں ، غوریوں ، غزنویوں ، مغلوں ، صفویوں ، فاطمیوں حتیٰ کہ اسماعیلیوں ، قرامطہ ، خاندانِ غلاماں اور ابدالی خاندان کے مستند تذکرے ہماری تاریخ کا بڑا قیمتی اور قطعاً غیر قیاسی سرمایہ ہیں ۔

آریائی اقوام کی تاریخ کا معیار

ہمارا تو یہاں تک اصرار ہے کہ چار یا پانچ ہزار سال قبل مسیح میں بابل سے، پامیر سے یا ہنگری سے اکنافِ عالم میں پھیل جانے والی آرائی اقوام کی تاریخ بھی قیاسی تاریخ نہیں ہے۔

اور یہ بات محض ہمارے ذہن کی پیداوار نہیں ہے، علمائے تاریخ ولسانیات میں سے بڑے بڑے فاضل علما مثلاً میکس مولر، اے وبّر، سچرپڈر، زمر، رو ہڈ، اوریسل، راگوزین، سپیگل ڈیرڈں، ہرڈر، ہیرین، گرم، باشم، راولسن، سڈنی سمتھ، گورڈن چائلڈ، ہنٹر، ودلی، ہیوکنیڈی، ہولڈچ اور بیڈن پادل اس بات کے قائل تھے۔

اور ہم معافی چاہیں گے اُنیسویں صدی کے ان محققین سے جنہوں نے انسانی کھوپریوں اور بعض دُوسرے اجزا کی دریافت پر آدمی کی زلیست کا رشتہ لاکھوں سال پیچھے تک ملا دیا ہے۔ مگر مذکورہ بالا علما کی اکثریت کا خیال صرف یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ آدمی کی عُمر بیس ہزار سال ہے اور جتنے بھی ٹھوس پتھر یا اینٹ کی شکل میں انسانی تمدّن وتہذیب کے آثار دُنیا بھر سے اب تک برآمد ہُوتے ہیں، وُہ آدمی کی عمر اس سے بھی کافی پیچھے تک محدود رکھتے ہیں۔

خود ایچ جی ویلز نے اپنی دُوسری بڑی تصنیف "آؤٹ لائن آف ہسٹری"

میں یہ دعویٰ بڑے وثوق کے ساتھ کیا ہے [1]

ایچ جی ویلز کے نزدیک انسان کی صحیح شعوری عمر آٹھ ہزار سال ہے [2] اور ان آٹھ ہزار سالوں کا علم جس طرح ہم تک پہنچا ہے اس کی وُہ رُوداد جو خالصتاً ہندوستان میں آنے والے آریاؤں سے مخصوص ہے، کیمبرج ہسٹری آف انڈیا اور میک کرنڈلے کی روسے ہمیں جن ذرائع سے معلوم ہوتی ہے' اس میں آریاؤں کی مقدس کتابوں، رگ وید، یجروید، اتھروید اور تشریحات برہما اپنشد، ستر، مہابھارت اور رامائن کے علاوہ وُہ جتکا کہانیاں اور پالی روایات بھی شامل ہیں جو علمائے لسانیات کی تحقیق و جستجو کی بُنیاد بنی ہیں۔

یقیناً علمائے لسانیات کو یہ شکایت ضرور رہی ہے کہ ان کتابوں میں ہندستان پر باہر سے حملہ کرنے والوں مثلاً دارا اوّل، سکندر اور سیلوکس کا ذکر نہیں ہے۔ اس کے باوجُود یہ آریائی بادشاہوں کی باہمی لڑائیوں اور بعض آریائی بادشاہتوں کے قیام و زوال کی داستان اچھی طرح بیان کرتی ہیں۔

کیمرج ہسٹری آف انڈیا کے ایک مقالہ نویس ڈاکٹر پروفیسر راپسن نے جن کا علم و فضل استاذ الاساتذہ کا علم و فضل تھا، بڑے وثوق سے دعویٰ کیا ہے کہ آریاؤں کی مذکورہ بالا مذہبی کتابوں میں جو مذہبی معلومات اور تاریخی کہانیاں بیان ہُوئی ہیں ان ہی سے علمِ تاریخ کا آغاز ہُوا ہے۔

مزید براں جن علمائے لسانیات و تاریخ کے نام ہم نے اُوپر گنوائے ہیں انہوں نے پری بُدھسٹ انڈیا کے تذکار میں جینی اور بُدھ روایات کو بنیادی استشہاد جانا ہے۔ نیز ان بیرونی تاریخی اسناد پر بھی بھروسہ کیا ہے جو اُن یُونانی سیاحوں نے قلم بند

---

[1] ایچ جی ویلز، آؤٹ لائن آف ہسٹری۔ آٹھواں ایڈیشن ص ۱۵۸ شائع کردہ کیسل اینڈ کمپنی۔ [2] ایضاً حوالہ سابق۔

کی ہیں جو ہندوستان میں ۴۸۴ - ۴۳۱ قبل مسیح کے وقت سے آنا شروع ہوئے تھے۔
ان میں مقدّمُ العہد سکائی لیکس اور ثانی العہد ہیروڈوٹس ہے۔
مشہور فاضل میک کرنڈلے نے ہیروڈوٹس کو تاریخ کا باوا آدم قرار دیا ہے۔
اس فاضل یُونانی سیّاح نے پاکستان، وسطی ہندوستان، سکاتھیا اور ایبی سینیا کے حالات قلم بند کیے ہیں۔ تیسرا یُونانی سیّاح کیٹیس یہاں آیا۔ اس کا زمانہ تین سو اٹھانوے سال قبل مسیح کا ہے۔ اس نے ایران کے بادشاہوں کے حالات بھی لکھے ہیں کیونکہ وُہ ایرانی دربار سے متعلّق تھا۔
۳۲۵ قبل مسیح میں سکندر مقدونی ادھر آیا۔ اس کے ساتھ کئی بڑے یونانی مؤرّخ بھی تھے۔ انہوں نے اس پُورے علاقہ کی تاریخ بڑی محنت سے لکھی۔ اس کی وجہ ایک تو یہ تھی کہ یہ کام ان کے ذوق میں شامل تھا اور دُوسرے یہ کہ سکندر نے انہیں سارے حالات قلم بند کرنے کے احکام دیئے تھے۔[1]
ان مؤرخین کی تحریروں میں میک کرنڈلے نے میگستھینز کی تحریر کو زیادہ اہمیت دی ہے کہ یہ مؤرخ مغربی پاکستان میں بہت دِن رہا تھا اور اس نے یہاں کے حالات کا مشاہدہ کیا تھا۔ میگستھینز کی تحریریں پہلے انڈین اینٹی کیوری میں چھپیں پھر میک کرنڈلے نے انہیں بڑے اہتمام کے ساتھ خود چھاپا۔
۲۴۰ قبل مسیح میں ایک اور یُونانی سیّاح ایراٹوستھنس نے اسی موضوع پر قلم اُٹھایا۔ وُہ دراصل جغرافیہ نویس تھا مگر جغرافیے کے ساتھ ساتھ اس نے تاریخی حالات کا ذکر بھی ضروری جانا۔ اس کا بیان میک کرنڈلے کے نزدیک اس لیے بھی قابلِ حجّت ہے کہ اس نے اپنے پیشرو میگستھینز اور سقیمی کے روزنامچے بھی ملحوظ رکھے تھے۔
اس ضمن میں یونانی مؤرّخ ڈیڈورس (سو سال قبل مسیح) پلوٹارک، سٹربو،

---

[1] میک کرنڈلے۔ اینشنٹ انڈیا۔ ص ۱۔ نیز ارلی ہسٹری آف انڈیا ص ۷

کوریوس، ایرین اور جیسٹوس نے بھی[1] آنے والی نسلوں کو اس خطّے کی تاریخ سے آگہی بخشی ہے اور یہاں کے حالات کو اپنے روزناموں میں خاصی نمایاں جگہ دی ہے سٹریبو اور ایرین کی کتابیں چھپ چکی ہیں اور ان کو پڑھ کر یہ اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے کہ اس خطّے کی تاریخ کئی سو سال قبل مسیح کن مراحل سے گزر رہی تھی۔

پروفیسر راپسن نے دعویٰ کیا ہے کہ اس دَور کی تاریخی دستاویزوں میں جو کمی تھی وُہ مذکورہ بالا روزناموں نے پُوری کر دی۔[2]

مشہور مؤرخ ونسنٹ سمتھ نے یہ بات بھی واضح کی ہے کہ سکندر مقدونی سے پہلے اس کے ساتھ اور اس کے بعد جو یونانی مؤرخ یہاں آئے، ان کی تصانیف کی قدر و قیمت اس وقت بہت بڑھ جاتی ہے جبکہ ان کا مقابلہ ان کی ہم عصر ہندی تصانیف سے کیا جائے۔[3]

پروفیسر راپسن نے بعض ان مغربی مؤرخین کا ذکر بھی کیا ہے جو سکندر مقدونی کی موت کے بعد چندر گپت اور اس کے ورثا کے عہد میں ہندوستان آئے تھے نیز راپسن یہ بھی کہتے ہیں کہ اس عہد میں بعض ایرانی اور یُونانی بادشاہوں پر بعض ملکی مؤرخین نے بھی قلم اُٹھایا تھا اور اپنے عہد اور ما قبل کے حالات تحریر کیے تھے۔[4]

سمتھ نے مہا بھارت اور رامائن کو بھی قابلِ استناد سمجھا ہے۔ نیز راج ترنگنی کو بھی کسی حد تک وقیع جانا ہے۔

بُدھسٹ انڈیا کے مصنّف کے نزدیک جینی تصانیف اور بدھ جتکا کہانیاں بھی قابلِ حجت ہیں خصوصیت سے اس لیے کہ ان میں چھٹی اور پانچویں صدی قبل مسیح کے بعض حالات بھی بیان ہُوئے ہیں۔

---

[1] میک کرنڈلے ترجمہ ٹوبی ص ۱۸۔ اینشنٹ انڈیا ص ۱۳۰۔ ص ۹-۱۰۔
[2] کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد اوّل ص ۵۹-۶۰۔
[3] ارلی ہسٹری آف انڈیا ص ۸۔ [4] کیمبرج ہسٹری آف انڈیا ص ۶۰۔

ہم آغاز میں مذکور انگریز مؤرخین پر الزام عائد نہیں کرتے۔ انہیں شاید معلوم نہ تھا کہ ایک بہت بڑے فاضلِ لسانیات ہرمن جیکوبی نے "سیکرڈ ٹیکس آف انڈیا" کے سلسلے کے جو پانچ اجزا چھاپے تھے ان میں ان تمام کتابوں کے اقتباسات پیش کیے تھے جو قدیم تاریخ پر لکھی گئی تھیں۔

حتیٰ کہ بعض علمائے تاریخ کے نزدیک سیلون کے پالی روزنامچے بھی بڑے قیمتی تاریخی مواد کے حامل ہیں۔ ان میں چندر گپت اور اس کے ورثا کے عہد سے متعلق خاصی معلومات درج ہیں[1]

پروفیسر سمتھ نے تو ہندوستان کی تاریخ کے باب میں پانچ پرانوں وایو، متسایا، وشنو، برہمد اور بھگوتا کو بھی اہم جانا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ ان پرانوں میں آریائی شاہی خاندان کے نام بھی درج ہیں اور شجرے بھی[2]

اور پھر ان چینی سیاحوں کے روزنامچوں کی حیثیت بھی بڑی وزنی ہے جو ایک سو سال قبل مسیح سے لے کر چھ سو سال بعد مسیح تک وقتاً فوقتاً ہندوستان اور پاکستان آتے رہے۔

ان میں جو پہلا چینی سیّاح ایک سو سال قبل مسیح یہاں آیا تھا وہ سوماچیان تھا۔ دوسرا نامور چینی سیّاح فاہین ہے جس نے ۳۹۹ ما بعد مسیح میں یہاں کی سیاحت کی تھی۔ اس کا سیاحت نامہ بہت مقبول ہوا ہے اور چار بار چھپ چکا ہے۔

آخر الذکر چینی سیّاح ہیون سانگ ہے جو ۶۲۹ء میں یہاں وارد ہوا تھا اور اس کی تصنیف ہندوستان اور پاکستان کی تاریخ پر ایک بہت گراں بہا کتاب تسلیم کی گئی ہے[3]

---

[1] ارلی ہسٹری آف انڈیا ص ۹-۱۰

[2] ایضاً حوالۂ سابق ص ۱۲-۱۳ [3] ارلی ہسٹری آف انڈیا ص ۱۲-۱۳

اور سب سے بڑھ کر پانچویں صدی ہجری کے مشہور مسلمان مؤرخ البیرونی کو علمائے تاریخ نے اس باب میں خراج ادا کیا ہے۔ یہ عظیم و جلیل مسلمان مؤرخ محمود غزنوی کے دربار سے متعلق تھا۔ محمود غزنوی کے ساتھ ہندوستان آیا اور اس نے ہندوستان میں کئی سال گذار کر اس ملک کی تہذیبی، ثقافتی اور مذہبی زندگی پر ایک غیر فانی کتاب، کتابُ الہند کے نام سے لکھی۔

علمائے مغرب نے ہندوستان کے حالات سے متعلق اس کتاب کو بڑی اہمیت دی ہے اور اصل بات یہ ہے کہ کتابُ الہند اپنے دَور ہی کی نہیں، موجُودہ دَور کی بھی بہترین تصنیف ہے۔ اس کا اصولِ نگارش اور اسلوبِ واقعہ نویسی نئے دَور کے ہر تصنیفی معیار پر پُورا اُترتا ہے۔

ایچ جی ویلز بہُت بڑے عالم تھے اور ان کا ہم خیال طبقہ بھی علم و فضل میں شاید کسی سے ہیٹا نہ ہو۔ اس کے باوجُود ہمیں ایسا لگتا ہے کہ جب ان حضرات نے انسانی تاریخ کے دو تین سو سال پہلے کے دَور کے عدم تیقّن کے بارے میں دعوٰی کیا تھا تو کم سے کم انہیں البیرونی کی یہ کتاب ہی سامنے رکھ لینی چاہیے تھی۔ یہ مغرب میں کئی بار چھپ چکی ہے اور اس کے کئی عمدہ تراجم ہو چکے ہیں۔

یہ ہر ایک کو معلوم ہے کہ محمود غزنوی گیارھویں صدی عیسوی کی شخصیت ہے یعنی وُہ آج سے کوئی نو سو سال پہلے اس دُنیا کو زیر و زبر کر چکا تھا اور اس کے دَور میں صرف البیرونی ہی نے نہیں اور بھی بہُت سے مصنفین نے بہُت اُونچے درجے کی کتابیں تالیف کی تھیں۔ ان میں سے انوری اور فردوسی کی شہرت تو آسمان کو چھُو رہی ہے۔

لسانی استشہاد اور وید

اسی پر موقوف نہیں ہے، علمائے لسانیات پروفیسر میکسی مولر، پروفیسر باشم، ایپلسن، سچریڈ، دبّر، گرم، زمر، اولڈن برگ، جیکوین، گوس وولڈ تھیبوٹ میکڈانل، ٹی برو اور رادلسن نے تو جتنی بھی لسانی تحقیقات کی ہے اس میں ان ہی کتابوں پر تکیہ کیا ہے جن کے وجود کو قیاسی قرار دیا گیا ہے۔

مثلاً رگ وید ان علمائے لسانیات کی تحقیق کی پہلی بڑی بنیاد ہے اور رگ وید کا زمانۂ تالیف تو بعض ہندوستانی علما کے نزدیک چھ ہزار سال قبل مسیح ہے۔

اگر ہندوستانی فضلا کا یہ دعویٰ نہ بھی مانا جائے تو بھی، جیسے کہ پروفیسر باشم اپنی مشہور تصنیف "ونڈر ویٹ واز انڈیا" میں وضاحت کرتے ہیں کہ رگ وید کی تاریخ کے آخری منتر اس بات کے شاہد ہیں کہ اس کتاب کی تالیف مہاتما بُدھ کی پیدائش سے بہت پہلے ہو چکی تھی [1]

پروفیسر بل گنگا دھار اتلک اس امر کے مدّعی ہیں کہ رگ وید ساڑھے چار ہزار سال قبل مسیح سے ڈھائی ہزار سال قبل مسیح تک کے دور میں لکھا گیا۔ [2]

پروفیسر جیکوبی، میکڈانل، تھیبوٹ اور اولڈن برگ کچھ زیادہ محتاط ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ رگ وید کو دو ہزار سال قبل مسیح کی تخلیق مانا جانا چاہیے [3]

پروفیسر میکس مولر اور مسٹر میکڈانل نے ژند اوستا اور رگ وید کے باہمی تقابل

---

[1] ونڈر ویٹ واز انڈیا - ص ۳۱-

[2] پری ہسٹارک انڈیا ص ۳۲۳ - ۲۲۴ - [3] ایضاً حوالۂ سابق -

کے بعد رگ وید کی عمر پندرہ سو سال قبل مسیح تجویز کی ہے۔

ان دونوں علماٗ کا خیال ہے کہ ژند اوستا اور رگ وید کے منتروں میں اس درجہ لسانی قرب اور مشابہت پائی جاتی ہے کہ ایک زبان کے منتر دوسری زبان میں بڑی آسانی کے ساتھ منتقل ہو سکتے ہیں، یہاں تک کہ شعری آداب بھی مجروح نہیں ہوتے۔

ٹی برو جو سنسکرت زبان کے بڑے ماہر پروفیسر تھے، رگ وید کی عمر بارہ سو سال قبل مسیح متعین کرتے ہیں [۱]

رگ وید کی تالیف کا کم سے کم زمانہ جس فاضل لسانیات نے تجویز کیا ہے وہ ڈاکٹر ونٹرنٹز ہیں۔ ان کے نزدیک رگ وید کی تالیف کا آخری دور آٹھ سو سال قبل مسیح تھا [۲]

پروفیسر باشم جو سنسکرت زبان کے شہرۂ آفاق استاد ہیں، رگ وید کی تصنیف کو دو ہزار سال اور پندرہ سو سال قبل مسیح سے منسوب کرتے وقت یہ گمان بھی ظاہر کرتے ہیں کہ یہ کتاب اس وقت لکھی گئی تھی جبکہ آریا قوم ابھی شمال مغربی ہند کے علاقوں پر پوری طرح غالب نہیں ہو سکی تھی [۳]

بہر قصہ اگر رگ وید میکس مولر کے خیال کی رو سے بارہ سو سال قبل مسیح کی تالیف قرار دی جائے تو بھی یہ لازم آئے گا کہ علمائے لسانیات نے آریہ قوم کی تہذیبی تاریخ کا سب سے پہلا انحصار جس کتاب پر کیا وہ بارہ سو سال قبل مسیح کی ہے اور بنی نوعِ انسان کی تاریخ کے روایتی علم کو بارہ سو سال قبل مسیح تک پھیلانا ضروری ہو گا۔

---

[۱] سنسکرت لٹریچر ص ۱۲ - پری بدھسٹ انڈیا ص ۲۱۴ - جنرل رائل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۹۱۷ء ص ۱۳۵ - [۲] پری ہسٹارک انڈیا ص ۲۲۷ -

[۳] ونڈر دیٹ واز انڈیا ص ۲۸ -

رگ وید، پنجاب اور یہاں کے آبادکاروں کی تہذیب

یہ بات موضوع سے ہٹی ہوئی نہیں ہے کہ رگ وید کی تصنیف کے متعلق میکس مولر، دبّر، میوئر، ہوپکنز، بچل اور گلڈنر کا دعویٰ ہے کہ یہ کتاب پنجاب کے میدانوں میں تصنیف ہوئی اور استدلال کیا ہے کہ رگ وید میں جہاں پنجاب کے سارے دریاؤں کا ذکر آتا ہے وہاں دریائے سرسوتی کا ذکر ایک سرحدی دریا کے طور پر ہوا ہے۔

ویدک انڈیا میں رگ وید کا ایک منتر نقل ہوا ہے جس کے الفاظ ہیں:۔

"سرسوتی تو اپنی ساتوں بہنوں سے زیادہ خوبصورت ہے۔ اس لیے کہ تو ہمیں ہمارے دشمنوں سے محفوظ رکھتی ہے۔"[1]

خیال ہے کہ سرسوتی دریا اس وقت انبالہ، رُہتک کے قریب بہتا تھا جو اُن دنوں پنجاب کا ایک سرحدی شہر تھا۔

پروفیسر برڈلے کیتھ جو اڈنبرا یونیورسٹی میں سنسکرت کے پروفیسر تھے، اس امر کے مدّعی ہیں کہ رگ وید میں جن دریاؤں کا بار بار ذکر کیا گیا ہے ان میں دریائے کابل (کبہ) دریائے سوات (سوستو) وادیٔ کابل، وادیٔ سوات، دریائے کرم، وادیٔ گومل، دریائے سندھو بہت ممتاز ہیں جس سے یہ مراد لی جاتی ہے کہ رگ وید ان دریاؤں سے متعارف تھا۔

اور سب سے عجیب بات یہ ہے کہ رگ وید نے سندھ کے زیریں حصے میں سندھ کے ساتھ ملنے والے دریاؤں کا نظارہ بھی کیا تھا اور دریاؤں کی اس صورتِ حال کو سندھو سمندر کا نام دیا تھا۔[2]

---

[1] ویدک انڈیا ص ۱۹۲۔

[2] ویدک انڈیا ص ۱۹۲۔

پنجاب کے پانچ دریاؤں میں سے رگ وید نے کسی کا ذکر نہیں چھوڑا۔ اس نے جہلم کو "وتستہ" چناب کو "اسکنی" راوی کو "ایراوتی" بیاس کو "دیپاک" اور ستلج کو "کندری ستاردو" کے نام دیئے ہیں اور ان تمام کے اوصاف اور کیفیت بیان کی ہے[1]

رگ وید کی تاریخی منزلت کا اندازہ اس سے بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے دریائے راوی کے کنارے لڑی جانے والی دس بادشاہوں کی لڑائی کی جو تفصیلات بیان کی ہیں۔ ان سے آریاؤں کے باہمی تصادم پر بڑی روشنی پڑتی ہے۔

فاضل لڈرگ کے نزدیک رگ وید نے محض دس بادشاہوں کی باہمی جنگ ہی پر روشنی نہیں ڈالی، پنجاب میں آباد سومیریوں یا دڑاوڑوں اور آریاؤں کے مابین پنجاب کے سب سے بڑے تہذیبی مرکز ہڑپا پر لڑی جانے والی لڑائی کا ذکر بھی کیا ہے اور اس بات پر فخر کیا ہے کہ آریاؤں نے ہڑپا کے باشندوں کو شکست دی تھی اور پھر آگے بڑھ کر سمندر تک جا پہنچے تھے۔ جیسا کہ ہم اُوپر کہہ چکے ہیں، سمندر سے مراد رگ وید کے نزدیک پنج ند کا مقام تھا۔

رگ وید دریاؤں کے علاوہ ان پہاڑوں کا بھی مداح ہے جن کو اس کے مؤلفین نے دیکھا تھا۔ رگ وید کا ایک مشہور منتر ہے جس میں شاعر پہاڑوں کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ وہاں سے دریا پھوٹتے ہیں اور وہاں درختوں کی بڑی بہتات ہے۔ رگ وید کے مؤلفین کو یہ بھی علم تھا کہ پہاڑوں کے اندر قیمتی معدنیات چھپی ہیں[2]

رگ وید کے شعرا نے اس پہاڑ کے بھی گُن گائے ہیں جس کے دامن سے چناب یا اسکنی نکلتا ہے۔ اس سے علمائے تاریخ نے یہ نتیجہ برآمد کیا ہے کہ آریا چناب کے

---

[1] کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد اوّل ص ۷۹۔

[2] ویدک انڈیا جلد ۲ ص ۲۱۔ ایضاً حوالہ سابق ص ۱۶۶۔ ویدک انڈکس جلد ۲ ص ۔ ۱۱

منبع تک پہنچ گئے تھے اور وہاں کے قدرتی نظاروں اور لطائف سے بہت محظوظ ہوئے تھے۔

کشمیر کے جنوب کی ایک زیریں پہاڑی سجادنت کی بھی رگ وید کے شعرا نے بڑی تعریف کی ہے۔ یہاں سوما بوٹی پیدا ہوتی تھی اور شعرا اس سے شراب کشید کرتے تھے۔

ہمالیہ کا ذکر بھی رگ وید نے بڑے اہتمام سے کیا ہے۔ اس کے شعرا اس کی برفانی چوٹیوں تک جا پہنچے تھے۔ اس کے جنگلوں، اس کے ندی نالوں اور پُورے ماحول سے خُوب لُطف اندوز ہُوئے تھے۔ وُہ بادلوں کی گرج، بجلی کی چمک، اولوں اور طوفانی بارشوں کا تجربہ بھی رکھتے تھے۔ اور ان ساری چیزوں پر انہوں نے خُوب شعر کہے۔

مشہور ہندو عالم رنگ اچاریہ بڑے وثوق سے کہتے ہیں کہ رگ وید میں دریاؤں اور پہاڑوں کا جو ذکر کیا گیا ہے اس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ رگ وید کی تصنیف کے زمانے میں آریہ پنجاب، کشمیر اور شمال مغربی اضلاع پر قابض ہو چکے تھے۔

ہم ایچ جی ویلز اور ان کے ہم خیال حضرات کو یہ کس طرح یقین دلائیں کہ ہمارے ملکِ پاکستان کی تاریخ اور یہاں آباد آریائی اقوام کی تہذیبی اور مذہبی روایات، عقائد اور مجلسی رسوم کے بارے میں رگ وید تاریخ کا بہت عمدہ موادِ مطالعہ فراہم کرتا ہے۔

فاضل ہیو کینڈی "لینڈ آف فائیو ریورز" میں رگ وید سے استناد کرتے ہُوئے کہتے ہیں کہ رگ وید کی رُو سے اس دَور کے آریاؤں کا مذہب سیدھا سادہ توہّم پر مبنی تھا۔ وُہ کائنات پر محیط اور اثر انداز طاقتوں مثلاً سُورج، آسمان، صبح کی روشنی، طوفانوں اور بادلوں میں چمکنے والی روشنی کو معبود قرار

دے کر اُن کی پرستش کرتے تھے [1]

پروفیسر برڈلے کیتھ کسی قدر تفصیل میں چلے گئے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ رگ وید کے دَور کے آریاؤں نے عظیم قدرتی عناصر کو بتوں کی شکل میں ڈھال لیا تھا۔ جو بُت انہوں نے تراشے تھے، ان میں دائیوس، پرتھوی اور وردنا شروع دَور کے بُت تھے۔ وردنا کو زیادہ تقدّس دیا گیا تھا اور رگ وید جا بہ جا اس کی حمد گاتا ہے [2]

دیوتا اِندر بھی وردنا کی طرح مقدس سمجھا جاتا تھا۔ یہ بارش برساتا، طوفان لاتا اور بادلوں میں چمکتا تھا۔ اگنی دیو ایک اور مقبول دیوتا تھا۔ رگ وید میں ایک ہزار قدیم منتر ہیں جن میں سے اندر دیوتا اور اگنی دیو کی تعریف کوئی پانچ سو منتروں میں کی گئی ہے [3]

پروفیسر سی مہنن راجہ نے رگ وید میں مذکور بعض اہم دیوتاؤں کے نام گنواتے وقت اسوین، سوتری، سریا، وردنا، اشاس، پشن، مردتس، رودرا سوما، وشنو اور دسوید بوس کو زیادہ اہمیت دی ہے [4]

محض یہی نہیں، رگ وید سے آریاؤں کے معبودوں کی اشکال کا پتہ بھی ملتا ہے۔ رگ وید میں جنّت و دوزخ کا تصوّر بھی موجود ہے۔ نیز رگ وید اس بات کا بھی قائل ہے کہ آدمی کی رُوح موت کے بعد زندہ رہتی ہے۔

رگ وید کے آریا اس بات کے بھی مُدّعی تھے کہ ان کے بعض معبود تنہا نہیں، جوڑے جوڑے تھے۔ ان میں کچھ دیوتا تھے اور کچھ دیویاں۔ آریاؤں کا یہ خیال بھی

---

[1] لینڈ آف فائیو ریورز ص ۳۲۔ [2] کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد اوّل ص ۱۰۳
[3] کلچرل ہیریٹج آف انڈیا ص ۲۴۔ [4] کلچرل ہسٹری آف انڈیا ص ۲۴-۲۵۔
جنرل رائل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۹۰۷۔ ٹیلرز پرمٹو کلچر جلد ۲۔

تھا کہ اگر وُہ دیویوں اور دیوتاؤں کے حضُور قربانیاں نذر کریں گے تو وُہ ان پر مہربان ہوجائیں گے۔ رگ وید میں ان قربانیوں کی پُوری تفصیل موجُود ہے۔

مِسٹر ٹیلر نے اپنی تصنیف "پرمٹو کلچر" میں رگ وید کے آریاؤں کی رسوم کا ذکر کرتے ہوئے "ستی" کا بھی ذکر کیا ہے اور رگ وید سے ایسے کئی منتر پیش کیے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب کوئی بڑا آدمی ان دنوں مرتا تو اس کے نوکر چاکر، اس کی بیویاں، اس کی داسیاں اور دُوسرے رشتہ دار اس کے ساتھ سفر کرنے کے لیے اپنے آپ کو مار لیتے تھے۔ رگ وید کی اس بات کی تصدیق ہیروڈوٹس نے بھی اپنے روزنامچے میں کی ہے۔

پروفیسر برڈلے کیتھ سنسکرت زبان اور رگ وید کے بڑے ماہروں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی رائے ہے کہ رگ وید اپنے دَور کی سیاسی زندگی کا بھی سب سے بڑا ماخذ ہے۔ کیونکہ رگ وید کے دور کے آریائی آبادکاروں نے اپنے پیچھے کوئی تمدّنی آثار ایسے نہیں چھوڑے ہیں، جن سے ان لوگوں کی باہمی دشمنیوں، دوستیوں اور سیاسی رُود داد کا پتہ ملتا۔ پروفیسر برڈلے کیتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس سلسلے میں تنہا رگ وید ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس کو تاریخِ قدیم کا ہر طالب علم استعمال کرنے پر مجبور ہے[1]

ویدک انڈیا کے حوالے سے ہم نے سرسوتی دریا کے بارے میں ایک منتر اُوپر نقل کیا ہے۔ اس منتر میں رگ وید کے ایک شاعر نے سرسوتی دریا کی تعریف اس لیے کی ہے کہ وُہ اس کے دشمنوں اور اس کی قوم کے مابین حائل ہے۔ اس سے ویدک انڈیا کے مؤلّفین نے یہ بجا استناد کیا ہے کہ رگ وید کے دَور کے پنجاب کی سرحد دریائے سرسوتی تھا اور یہ کہ اس دریا کی وجہ سے اس سمت کے آریا دُوسری طرف کے

---

[1] کیمبرج ہسٹری آف انڈیا ص ۸۱۔

آباد کاروں کے حملوں سے محفوظ رہتے تھے۔ نہ یہ اُس پار جا سکتے تھے اور نہ وُہ اس پار آ سکتے تھے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کے لوگ کشتیاں بنانے پر قادر نہیں ہوئے تھے۔ اور نہ پُل بنانے کا فن جانتے تھے۔

ویدک انڈیا کے مصنّف کی رُو سے رگ وید نے اپنے دَور کی جس سب سے بڑی لڑائی کا بار بار ذکر کیا ہے یہ وُہ لڑائی ہے جس میں دس بادشاہتیں شریک ہُوئی تھیں۔

رگ وید اس لڑائی کے اسباب بھی بیان کرتا ہے۔ ہم اس تفصیل میں نہیں جائیں گے۔ صرف اتنا اشارہ کریں گے کہ رگ وید کی یہ شہادت اس امر پر دال ہے کہ اس وقت کے آریائی مقبوضات میں دس بادشاہتیں قائم تھیں۔ سب سے بڑا بادشاہ سوداس تھا جو بھرت قبیلے کا سربراہ تھا۔ وہ قبیلہ ترستو سے تعلق رکھتا تھا اور اس کے ایک سابق وزیرِ اعظم وشوامتر نے اس کے خلاف متسیا، بھمت، پرکھتو، بھولان، پلان ناس، ایسنا، دشنی، سیوا، سیوی، آجا، سگرو اور یکشو قبیلوں یا خودمختار بادشاہوں کو لا کھڑا کیا تھا۔ رگ وید ہی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان قبائل میں سے پانچ قبیلے پہاڑی تھے۔ متسیا چترال کے، پکھتو شمال مغربی سرحد کے، بھولان ناس (بولان) کوئٹہ کے نواح کے، سیوی۔ شورکوٹ اور جھنگ کے درمیانی علاقے کے اور دشنی راولپنڈی اور جہلم کی سرزمین میں آباد تھے۔

رگ وید نے ان قبیلوں کے بادشاہوں کے نام بھی شمار کیے ہیں اور یہ نام سیمو، ترداسا، دھرویو، کورشا، پورو، آنو، بھیدا، سمبرا، دکارنیکا اور یدو تھے اور ان میں سے رگ وید کے نزدیک پورو، یدو، ترداسا، آنو اور دھرویو بڑے بہادر اور مشہور تاجدار تھے۔

رگ وید نے یہ صراحت بھی کی ہے کہ دس بادشاہوں کی یہ لڑائی راوی کے

کنارے لڑی گئی تھی۔ سوداس جیتا اور اس کے مقابل بادشاہ ہارے۔ ان میں سے اکیّس بڑے شہزادے قتل ہُوئے۔ ان میں ان کا جرنیل بھید ابھی تھا۔

رگ وید مقتولین کی تعداد بھی بتاتا ہے اور کہتا ہے کہ مرنے والے چھیاسٹھ ہزار چھ سو ساٹھ تھے اور فاتح سوداس کو بے شمار مال و متاع ہاتھ آیا تھا۔

اس لڑائی کے بعد بھرت قبیلے کو سیاسی برتری حاصل ہوئی اور ان ہی کے نام پر سرسوتی سے پرے کے مُلک کا نام بھارت ہُوا۔ حالانکہ یہ لڑائی فیصلہ کُن تھی مگر ہارے ہوئے قبیلوں کی خُود مختاری پہلے ہی کی طرح قائم رہی اور سوداس نے ان کے علاقوں پر تاراخت نہیں کی۔ خصوصاً پورو قبیلہ نے تو آگے چل کر اس علاقے میں بڑی طاقت حاصل کرلی جو سرسوتی اور ستلج کے مابین واقع تھا۔

پروفیسر برڈلے کیتھ اس بات کے بھی مدّعی ہیں کہ رگ وید نے پورو قبیلے کی بستیاں تک شمار کی ہیں، اس کے بادشاہوں کا شجرۂ نسب بھی بیان کیا ہے اور ایک بادشاہ پورو کتسا کی رانی کے حالات سے بھی دلچسپی لی ہے اور اس کے ایک وارث کی نوعمری سے لے کر اس کی جوانی اور پھر اس کے سیاسی عروج کی ہر کیفیت پر روشنی ڈالی ہے۔[1]

رگ وید چناب اور راوی کے مابین آباد قبیلوں آنو، تر واسا اور دھریو اور بل ہیکا کے نام بھی گنواتا ہے اور یہ بھی کہتا ہے کہ دھریو کے ہمسائے تر واسا تھے اور یہ تر واسا بڑے لڑاکے تھے۔ انہوں نے سوداس اور دُوسرے بادشاہوں سے بڑی لڑائیاں لڑی تھیں۔

دریائے جہلم اور چناب کے علاقے کے آباد کاروں سجاونت مہاورش، اتراکورو اور مدرا کو رگ وید نے بڑا اہم جانا ہے رگ وید کے نزدیک یہ قبیلے وادیٔ کشمیر

---

[1] ویدک انڈیا ص ۱۹۵۔ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد اوّل ص ۸۲

تک پھیلے ہوئے تھے۔[1]

مزید برآں رگ وید نے دریائے سندھ اور جہلم کے درمیان رہنے والے قبیلوں آنو، یدو، گندھارا، سیوی، کیکائی، دریچی دنت اور سرنجایا کو نمایاں ٹھہرایا ہے۔[2]

رگ وید نے ایک بڑے بادشاہ اسی نارا کا ذکر بھی بڑے فخر کے ساتھ کیا ہے اور اسے سیوی ریاست کا بانی ٹھہرایا ہے۔

رگ وید کی اس بڑی شخصیت کا ذکر مہابھارت اور جتکا کہانیوں میں بھی ہوا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ رگ وید کی شہادت کچھ نہ کچھ سند ضرور رکھتی ہے۔ اور اس بات کا مزید ثبوت ان یونانی روزنامچہ نویسوں سے ملتا ہے جو سیوی ریاست کو پنجاب کی سب سے بڑی ریاست قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ریاست سکندر مقدونی کے حملے کے وقت تک موجود تھی۔[3]

رگ وید کی تاریخی حیثیت کی ایک اور شہادت یہ ہے کہ رگ وید نے گندھارا قبیلے کے بارے میں کہا ہے کہ وہ وادئ کابل اور وادئ سندھ اور دریائے گومل کے درمیانی علاقے میں آباد تھا۔ نیز پکھتو قبیلے کے بارے میں صراحت کی ہے کہ وہ گندھارا قبیلے کی ایک شاخ تھا اور دریائے کرم اور گومل کے مابین رہتا تھا۔ مابعد تاریخ نے حرف بہ حرف اس امر کی تصدیق کی ہے اور پکھتو کو پختو یا پختون قبیلہ ٹھہرایا ہے۔

رگ وید نے بلوچستان کے جن قبیلوں کو اہمیت دی ہے ان میں بھولان اور بولناس تھے۔ رگ وید گو ان کے ذکر میں اختصار سے کام لیتا ہے تاہم ان کی تمام خصوصیات اور جغرافیائی حالات کو بیان کر گیا ہے۔

---

[1] ویدک انڈیا ص ۱۹۱
[2] دی انڈین کنسٹرز ٹرائبز ص - ۱۵۹ -
[3] کوویل جلد ۶ ص ۵۵

رگ وید کی تاریخی اہمیت اس امر سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ اس نے آریاؤں کی آمد کے وقت اور آباد کاری کے دوران یہاں کے باشندوں سے لڑائیوں کا حال بھی بیان کیا ہے۔

رگ وید کے نزدیک آریاؤں کی زیادہ تر لڑائیاں داسیو یا داسوں سے ہوئی تھیں جو یہاں کے پہلے آباد کار تھے۔

ہم اس تفصیل میں نہیں جائینگے۔ہم نے اُوپر کی بحث بھی صرف اس لیے کی ہے تاکہ یہ بتا سکیں کہ بعض انگریز اور امریکی مصنّفین کا یہ خیال بالکل بے بنیاد ہے کہ دو چار سو سال پہلے تک انسانی تاریخ محض قیاس آرائی تک محدُود تھی۔

یہ قیاس آرائی نہیں ہے۔ اگر قیاس آرائی ہوتی تو رگ وید جو کم سے کم بارہ سو سال قبل مسیح کی تالیف ہے، جن حالات کا ذکر کرتا ہے وُہ نئے تحقیقی دَور میں غلط ثابت ہوتے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اور پھر سینکڑوں علمائے تاریخ نے اور نامور محقّقین نے اس پر اپنی تحقیق کی بنا رکھی ہے اور ہندوستان میں آباد ہونے والے آریاؤں کی ایک ایسی مربُوط تاریخ مرتب کر دی ہے، جسے جھٹلانا سینکڑوں اعلیٰ درجے کی تالیفات اور کوئی ایک سو سال کے تحقیقی کام پر تباہی نازل کرنے کے مترادف ہے۔

قدیم تاریخِ ہند کے دُوسرے مآخذ

رگ وید تو خیر رگ وید ہے جو پاکستان کے ماضی کے صرف ایک دور کا ترجمان ہے، پروفیسر برڈلے کیتھ اور پروفیسر جیکوبی جیسے علمائے تاریخ کا خیال ہے کہ یجر وید، سام وید، اتھر وید اور ان کی شرحیں حتیٰ کہ جنکا کہانیاں تاریخی اور ثقافتی نقطہ نگاہ سے بہت مفید نتائج کی حامل ثابت ہُوئی ہیں اور ان کی مدد سے خُود انہوں نے بھی اور دُوسرے علمائے تاریخ نے بھی رگ وید کے مابعد کے دور کے آریاؤں اور دُوسری ہندوستانی اقوام کی سیاسی اور اجتماعی زندگی کی ایک بڑی مرتب رُوداد تیار کی ہے۔

ان لوگوں کا خیال ہے کہ مذکورہ بالا کتابوں کی شہادتوں کی رُو سے اس دَور میں جو آٹھ سو سال قبل مسیح کا دور تھا آریائی قبائل کے تند و تیز ریلے دریائے سرسوتی سے جا ٹکراتے تھے اور ان کی سیاست پانچ دریاؤں کی سرزمین تک محدود نہیں رہی تھی۔

پروفیسر برڈلے کیتھ نے اس دور کے آریائی علاقوں کی جغرافیائی حدود میں تبدیلی پر بحث کرتے وقت مذکورہ بالا کتابوں سے یہ شہادتیں بھی مہیّا کی ہیں کہ بھرت قبیلہ جو رگ وید کی تیسری اور چوتھی کتاب کا ہیرو ہے اب سیاسی اہمیت سے محروم ہو گیا تھا اور اس کی جگہ کورو قبیلے نے لے لی تھی اور اس کے ہمسائے میں آباد پنچال بھی بڑی اہمیّت حاصل کر گئے تھے اور یہ دونوں قبیلے نو وارد ہونے کے باوجود بہت مُنہ زور تھے۔

ان ہی کتابوں سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ کورو قبیلے کے ہراول دستے تو

سرسوتی اور جمنا تک پہنچ گئے تھے مگر باقی ماندہ لوگ کوہ ہمالیہ کی ترائیوں اور وادیٔ کشمیر کے ہموار میدانوں میں ابھی تک آباد تھے۔ دریائے سندھ اور چناب کے کناروں پر بھی ان ہی کی حکمرانی تھی۔

مذکورہ بالا کتابوں میں سے ایک کی شرح کیتھ پاتھ برہمنا سے یہ شہادت بھی میسّر آتی ہے کہ پنچال قبیلہ پانچ قبیلوں پر مشتمل تھا۔[1]

یہ کتابیں کورو اور پنچال کی یلغاروں اور فتوحات پر بھی روشنی ڈالتی ہیں یہاں تک کہ ان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کورو قبیلہ جب ہندوستان میں داخل ہُوا تو اس نے چترال اور گلگت کی راہ اختیار کی تھی۔[2] اس قبیلے کے دو بادشاہ پارکشت اور جنامی جایا نے تو بڑی فتوحات پائیں اور بڑی حیثیت حاصل کر لی تھی۔[3]

پنچال بادشاہوں میں سے کریوا سونا، ستراشا اور درمکھا کو بھی ان کتابوں نے اپنا ممدوح ٹھہرایا ہے۔ آخر الذکر بادشاہ کے بارے میں تو کہا گیا ہے کہ اس کی ریاست کی ایک سمت کی سرحد دریائے جمنا تھی اور دُوسری طرف اس کا اِقتدار سبّی تک پھیلا ہُوا تھا۔[4]

جتکا کہانیاں بھی اس سلسلے کی ایک اہم تاریخی کڑی ہیں اور ان کے ذریعے اس دور کی تاریخ میں بڑا تسلسل پیدا ہوتا ہے۔[5] جتکا کہانیاں یہ راز بھی کہتی ہیں کہ جب کورو اور پنچال بڑی سیاسی قوّت تھے تو گندھارا نامی ریاست بھی اپنے جوبن پر تھی اور اس کے بادشاہ ناگے یا اشوری تھے جو مذکورہ بالا آریائی قبیلوں کے بڑے رقیب تھے اور ان کا پایۂ تخت ٹیکسلا تھا۔[6]

---

[1] کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد اوّل ص ۱۱۸۔ نیز ارلی ہسٹری آف انڈیا بائی پانیکار ص ۱۷۔ [2] ایضاً صفحہ ۱۱۸
[3] اشوریا انڈیا ص ۳۸ [4] کردنالوجی آف اینشنٹ انڈیا ص ۲۴۸
[5] پری بڈھسٹ انڈیا ص ۳۴ [6] پری بڈھسٹ انڈیا ص ۱۲۳

جتکا کہانیاں یہ بات بھی کہتی ہیں کہ اس دور کے بادشاہوں کی شان و شکوہ بہت بڑھ گئی تھی۔ وہ جمہوریت پسند نہیں رہے تھے، محلات میں رہائش رکھتے تھے اور انتہائی تعیش کی زندگی گزارتے تھے[1]۔

پری بدھسٹ انڈیا کے مصنف نے کئی جتکا کہانیاں پڑھنے کے بعد یہ رائے قائم کی ہے کہ اس دور کے راجا بڑے ظالم اور جابر تھے اور ان کے عہد میں رعایا نے کئی بغاوتیں کی تھیں[2]۔

پرانوں میں سے دو پرانوں، تیتریہ برہمنا اور ساتھ پاتھ، کے مطالعے کے بعد پروفیسر برڈے کیتھ نے شاہی خاندانوں، ان کے لواحقین اور وزرا تک کے اختیارات اور حکومت کے نظم و نسق کے نگرانوں کی تفصیل بھی پیش کی ہے۔

بیڈن پاول اور ہیو کینڈی نے تو اپنی تالیفات میں ان کتابوں کی مدد سے آریائی اور ان سے پہلے کے آباد کاروں کی سیاسی، اجتماعی اور معاشی زندگی کے ایک ایک شعبے پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے[3]۔

اے بی ہویل تو اس امر کے مدعی ہیں کہ مہا بھارت کے دور کے آریا عوام بادشاہوں کی ذات اور ان کے خاندان کے تقدس پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ وہ بعض اوقات بادشاہوں کو بھی معزول کر دیتے اور ان کے وزرا کو بھی[4]۔

یہ تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ہے۔ بختصر یوں سمجھیے کہ رگ وید، یجر وید، سام وید ان کی شرحوں اور جتکا کہانیوں کی مدد سے آریاؤں کے ہندوستان میں داخلے کے وقت سے لے کر ان کے دریائے گنگا و جمنا کے مابین آباد ہونے کے دور تک کی ضروری تاریخ مرتب کر لی گئی ہے اور اس موضوع پر علما کی ایک بڑی تعداد

---

[1] پری بدھسٹ انڈیا ص ۱۳۲۔ [2] ایضاً حوالہ سابق نیز کیمبرج ہسٹری آف انڈیا۔
[3] بیڈن پاول ص ۷-۹ - ۷۲ - ۲۲۱ لینڈ آف فائیو ریورز
[4] ایرین رول ان انڈیا ص ۳۴-۳۵۔ [3] ہسٹری آف ایرین ص ۱۳۱-۱۳۲۔

نے بڑی معیاری کتابیں تیار کی ہیں اور یہ کتابیں تاریخ کا بڑا سرمایہ ہیں۔

اس سلسلے میں یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ ہندوستان کے مشہور جین مت اور بُدھ مت کے بارے میں جو رُوداد بعد کی نسلوں کو معلوم ہوئی ہے، اس میں یقیناً بعض استشہاد پتھروں کی زبان کے بھی ہیں۔ پتھروں سے بنی ہُوئی خانقاہوں نے بھی ان مذاہب کی عکّاسی کی ہے۔ مگر زیادہ تر ان مذاہب کے بارے میں معلومات ہمیں جین اور بُدھ روایات کے ذریعے میّسر آئی ہیں۔

آپ کو یہ حق تو حاصل ہے کہ ان میں سے توہّم پر مبنی روایات کو ترک کر دیں مگر ایسی روایات جو محض تاریخی حیثیت کی ہیں، لازماً سُننا ہوں گی اور ان کو ماننا بھی ہوگا ورنہ نہ تو مہاتما مہاویرا کی شخصیّت تاریخ کے سامنے آئے گی اور نہ گوتم بُدھ کی تاریخی حیثیت ہی واضح ہو سکے گی۔

شاید یہ امر موجبِ اطمینان ہو کہ جین مت اور بُدھ مت کی تاریخ کی جن علما اور فضلا نے حد درجہ جستجو کی ہے مثلاً وِبّر، لیسین، ایچ ایچ ولسن، کول بروک، پرنسپ سٹیونسن، ای تھامس، جارل چارپنیٹر اور ڈاکٹر ہورنلے ہیسٹنگز وُہ بڑے اونچے درجے کے محقّق اور مؤرّخ تھے اور ان حضرات کی تحقیق و جستجو کا زیادہ تر انحصار جینی اور بدھ روایات پر ہے۔

یہ روایات یقیناً مبالغے سے پُر ہیں۔ ان میں سچائی کو بڑی محنت کے ساتھ کُریدنا پڑتا ہے لیکن ان کہانیوں کی راکھ کے اندر سے حقیقت کی چنگاری بہرحال مِل جاتی ہے۔

قرآن کے نزدیک علمِ تاریخ کی اہمیّت

علم تو بنی نوعِ انسان کا سب سے قیمتی گہنا ہے۔ ہمارے نبیؐ پاک کی ایک مشہور حدیث ہے کہ سچّی بات کہیں سے بھی مل جائے، اُسے قبول کرنے میں تامّل سے کام نہیں لینا چاہیے۔ اور پھر تاریخ تو خواہ کسی قوم، کسی ملّت اور کسی بھی ملک دوستوں یا دشمنوں کی ہو اس میں ہماری نئی نسل کے لیے بڑے سبق اور بڑی عبرتیں جمع ہیں

یہ تاریخ ہی کا علم ہے جس سے ہم کو پچھلی قوموں کی غلطیوں، کوتاہیوں، عروج کے اسباب اور زوال کی وجوہ معلوم ہوتی ہیں۔ پچھلی قوموں نے جو راستے اپنے لیے اکنافِ عالم میں تراشے، جو پگڈنڈیاں روشن یا دھندلی اختیار کیں، جس نہج کی زندگی گزاری، جن ہولناکیوں اور تباہیوں سے دوچار ہوئیں اور جو رفعتیں یا بلندیاں حاصل کیں ان کی روداد صرف تاریخ کی زبان سے ہماری سماعت تک پہنچتی ہے۔

قرآنِ پاک سے بڑا صحیفۂ دانش و فکر اور رہنمائے صراطِ مستقیم اور کون ہے؟ اس کتابِ الٰہی کا ورق ورق اُلٹیے تو یہ ماضی کی گم کردہ راہ قوموں، جابر و قاہر بادشاہوں، فرعونوں، ہامانوں، عاد و ثمود، آلِ شعیب، اہلِ مدین، قومِ لوطؑ، بنی اسرائیل اور ان کی گمراہیوں کے قصّے بار بار دہراتی ہے اور اس لیے دُہراتی ہے کہ محمدِ عربی کو رہنما و ہادی ماننے والی قوم گزشتہ قوموں کی غلطیوں سے عبرت پکڑے اور سیدھی راہ پر چلنے کا سلیقہ سیکھے۔

ہمارا پختہ خیال ہے کہ دُنیا میں جتنے بھی علوم ہیں ان سے لوگوں کا تعلّق محدود

ہوتا ہے۔ کوئی علم ایسا نہیں جس کا تعلّق کسی نہ کسی انداز میں تمام لوگوں سے ہو، پڑھنے والوں سے بھی، معلّموں سے بھی، اور متعلّموں سے بھی، درس گاہوں میں داخل ہونے والوں سے بھی اور جو درس گاہوں میں نہیں ہیں ان سے بھی۔ یہ صرف ایک ہی علم ہے اور یہ تاریخ کا علم ہے، جس سے ہر فرد کسی نہ کسی انداز میں وابستہ ہوتا ہے۔ ایسے لوگ تو معدُودے چند ہوتے ہیں، تاریخ جن کی پیداوار ہوتی ہے۔ لیکن باقی بجا طور پر تاریخ کی پیداوار ہوتے ہیں۔ کچھ تاریخ کی مخلوق ہوتے ہیں۔ کچھ تاریخ کے بہاؤ کو اپنے انداز میں موڑنے کی کوشش کرتے ہیں وگرنہ ہر ایک تاریخ کے جلو میں اس کے بہاؤ میں بہتا نظر آتا ہے۔

مگر ان بحثوں سے قطع نظر جو تاریخ کے تصوّر اور فلسفے کے ضمن میں اہلِ علم کے سامنے ہیں اور ان تصوّرات سے قطع نظر جو تاریخ کی مادی تعبیر کرتے ہیں، ہم نے اپنے حقیر مطالعے سے، اسلام کے مطالعے سے اور قرآنِ حکیم کے ایک ادنیٰ طالبِ علم ہونے کی حیثیّت سے جو بات سمجھی ہے وُہ یہ ہے کہ تاریخ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو از خُود جنم لیتی ہے یا اندھی بہری طاقت کی حیثیت رکھتی ہے بلکہ تاریخ ایک خدائی عمل ہے۔

قوموں کے عروج و زوال کی وجوہ کیا ہیں؟ یہ بہُت لمبی بحث ہے لیکن ہم اتنا ضرور کہیں گے کہ قوموں اور تہذیبوں کے عروج کی بنیاد چار چیزیں ہیں اور تاریخ کا مطالعہ کرنے سے بہ ادنیٰ تامّل ہر شخص اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے خُود قرآنِ حکیم سے بھی ان کا سُراغ ملتا ہے۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ جس قوم کو بھی تاریخ میں عروج حاصل ہوتا ہے اور جو قوم بھی پائیدار نقوش تاریخ کے صحرا میں چھوڑ کر جاتی ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ وُہ اپنے مقصد کا عشق رکھے۔ اس کے سامنے کوئی متعیّن

نصبُ العین ہو ، وُہ عزم کی صفت سے بہرہ ور ہو اور یقین و ایمان کی دولت سے مالا مال ہو - اسے اپنے مقصد سے لگاؤ ہو عشق ہو ، وابستگی ہو - اس میں قربانی کا جذبہ ہو - اس مقصد اور یقین اور اس ایمان کا قدرتی نتیجہ عمل ہے - اس Conviction کا قدرتی نتیجہ Action ہے -

اگر ایک قوم یہ اِدّعا کرتی ہے کہ وُہ ایمان رکھتی ہے لیکن وُہ ایمان عمل کے سانچے میں نہیں ڈھلتا تو وُہ ایمان راسخ نہ تھا - وُہ یقین پختہ نہ تھا - وُہ مقصد گہرا نہ تھا - وُہ دل میں بیٹھا نہ تھا - اس لیے وُہ عمل کا رنگ اختیار نہیں کر سکا - یہ ہو نہیں سکتا کہ مقصد کا بیج دل میں بو یا گیا ہو اور اس سے عمل کا شجر بار آور نہ ہو - یہ ہو نہیں سکتا کہ مقصد کی بنیاد رکھی جائے اور اس پر کوئی عمارت عمل کی نظر نہ آئے - یہ ہو نہیں سکتا کہ مقصد اور ایمان کا پھُول دامن میں ہو اور وُہ خُوشبو عمل کی صورت میں نہ دے - یہ دونوں باتیں سمجھ میں نہیں آسکتیں - اس لیے یقین اور ایمان اور Faith کا قدرتی نتیجہ عمل ہے -

اس کے بعد تیسری بُنیاد جو عروج پانے والی قوموں کی داستان میں نظر آتی ہے وُہ یہ ہے کہ ایسی قومیں اپنے یقین اور عمل کے نتیجے میں حاصل ہونے والی سچائیوں کو عام کرتی ہیں - اپنی قوم کے افراد کو Educate کرتی ہیں - انہیں علم اور عمل کے زیور سے آراستہ کرتی ہیں - ان کے دل میں بھی صحیح تڑپ پیدا کرتی ہیں اور پھر انہیں بھی باعمل بناتی ہیں - انہیں صحیح جذبہ عطا کرتی ہیں - پھر اس راستے میں جو تکالیف اور مشکلیں پیش آتی ہیں ان پر ثابت قدمی اور پامردی سے قائم رہتی ہیں اور ان کا قدم صراطِ مستقیم سے نہیں ہٹتا -

یہ جو باتیں ہم نے کہی ہیں ، قرآنِ حکیم نے بھی ان کو پیش کیا ہے - اور حقیقت میں یہ قرآنِ حکیم ہی کا نظریہ ہے - وُہ مشہور سُورہ آپ کو یاد ہو گی

جس میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے کہا ہے "والعصر" زمانے کی قسم اور یہ قسم شہادت کے طور پر کھائی گئی ہے کہ زمانہ گواہ ہے اور زمانہ تاریخ ہے یعنی کہ تاریخ گواہ ہے۔ اس کو تقویّت اس بات سے بھی پہنچتی ہے کہ خُدا کسی ایسی چیز کی قسم نہیں کھا سکتا کہ جو مقدس نہ ہو۔

وُہ حدیثِ پاک بھی آپ کے سامنے آئی ہو گی جس میں حضورؐ نے ارشاد فرمایا ہے۔ "لا تسبُّ الدھر" زمانے کو گالی نہ دو، اِس لیے کہ زمانہ میں خود ہُوں۔ خُدا کہتا ہے کہ میں وقت ہوں۔ میں زمانہ ہوں۔ میں تاریخ ہُوں اس لیے گردشِ ایّام نام کی کوئی چیز نہیں ہے جس کے بارے میں یہ کہا جائے کہ وقت نے اپنا منحوس سایہ ڈال دیا۔ جیسے کہ شاعری میں یہ طریق مستعمل ہے کہ زمانے کو گالی دی جاتی ہے، گردش لیل و نہار کو بُرا بھلا کہا جاتا ہے۔ گردشِ لیل و نہار ایک ذات کے تابع ہے، اس کی قضا و قدر کے تابع ہے اس کے وسیع تر منصوبے کے تابع ہے۔

خُدا نے زمانے کی قسم کھانے کے بعد یہ حقیقتِ کبریٰ بیان فرمائی ہے کہ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ یقیناً انسان خسارے میں ہے اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ان لوگوں کے سوا جو ایمان لائے وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جنہوں نے باقی رہنے والے اچھّے عمل کیے۔ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ جنہوں نے حق کی وصیّت کی وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ جنہوں نے صبر کی وصیّت کی اور صبر کی بات عام کی۔

بدقسمتی سے ہمارے ہاں صبر کا مفہوم مختلف ہے۔ رائج الوقت مفہوم صبر کا بے چارگی اور بے بسی ہے۔ کسی پر ظلم ڈھایا گیا اور وُہ کچھ کرنے کے قابل نہ ہُوا تو اس نے صبر کر لیا۔ اندھا اگر یہ کہے کہ میں نہیں دیکھوں گا تو ظاہر ہے وُہ دیکھ ہی نہیں سکتا وُہ کیا دیکھے گا؛ یہ صبر نہیں ہے کہ انسان بے بسی اور بے کسی کو صبر کا نام دے۔ بلکہ

قرآنی مفہوم میں صبر مقاومت، پامردی، استقامت اور مقصد کی راہ میں آنے والے تمام مصائب کا پامردی کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے اپنے رستے پر قائم رہنا ہے۔ یہ ساری باتیں صبر کے مفہوم میں شامل ہیں۔

صبر اصل میں اس جوہر کا نام ہے کہ انسان ہزار مشکلوں، ہزار مصیبتوں اور ہزار تکلیفوں کے ہجوم میں بھی اپنے رستے سے نہ بھٹکے، اپنے مقصد کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے اور جو اس کا عقیدہ ہے اس سے رُوگردانی نہ کرے۔

یہ تاریخ کا سبق ہے کہ تاریخ میں ایسی ہی قوموں کو عروج حاصل ہُوا ہے جو صبر، ضبط اور عزم و عمل سے متّصف تھیں اور جن کے اعمال، جن کے کام اور جن کی کارکردگی انسانی معاشرے پر پڑنے والے مستقل نوعیت کے اثرات چھوڑنے کے قابل ہیں۔ یہی بات قرآن نے بھی کہی ہے۔ وَاَمَّا مَنْ یَّنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ وہ چیز جو انسانوں کو نفع پہنچاتی ہے، وہ عمل جو انسانوں کے لیے مُفید ہوتا ہے، وہ فلسفہ جو انسانیت کو فروغ بخشتا ہے، وہی زمین پر باقی رہتا ہے۔

یہ انسانی عروج و زوال کی اصل ہے کہ وہ قومیں جنھوں نے انسانیت کے لیے نفع بخش کام کیے وہ دنیا میں اُوپر اُٹھتی ہیں اور ان کا وجُود باقی رہتا ہے۔ وہ غیر معمولی عروج پاتی ہیں لیکن جب وہ ایسے کام کرتی ہیں جو انسانیت کے لیے ضرر رساں ہوتے ہیں تو عروج کی بجائے زوال کا شکار ہو جاتی ہیں اور زوال کا آغاز عام طور پر ہر قوم کے خوش حال طبقات سے ہوتا ہے جو سرمایہ دار ہوتے ہیں، جو دولت کے سرچشموں کے مالک ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کی خرابیوں سے قوم مائل بہ زوال ہونے لگتی ہے۔

یہ ہمارا اپنا نظریہ نہیں ہے۔ یہ قرآنی نظریہ ہے کہ جب کسی قوم کے بااثر اُمرا کے کردار کا معیار بگڑ جاتا ہے۔ جب یہ لوگ فسق و فجُور اور گناہوں کے عادی بن

جاتے ہیں۔ جب وُہ خدا کی مقرر کردہ حدود کو توڑ دیتے اور قدرت کے اصولوں پر عامل نہیں رہتے تو خُدا ان کی قوم پر تباہی لے آتا ہے۔

قرآنِ حکیم میں جگہ جگہ بیان کیا گیا ہے کہ کسی قوم کے زوال کا سبب اُس کی زیادتیاں اور مظالم ہوتے ہیں۔ آپ کے سامنے وُہ حدیثِ نبوی بھی ہوگی کہ کافر کی حکومت تو قائم رہ سکتی ہے لیکن ظالم کی حکومت کو دوام حاصل نہیں ہو سکتا۔ ظالم کی حکومت میں برکت پیدا نہیں ہو سکتی اور یہ خُدا کا اصول ہے کہ ایسی حکومت ختم کر دی جاتے۔ جس سوسائٹی میں بھی ظلم کا دور دورہ ہوتا ہے، جو معاشرہ بھی استحصال کا عادی بن جاتا ہے، جس میں بھی معاشی اُونچ نیچ ہوتی ہے، جس میں بھی غریبوں کی کمزوری سے بااثر لوگ ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہیں، جس میں بھی زبردست طبقے زیردستوں کے حقوق کا لحاظ نہیں رکھتے، جہاں بھی عاجز اور درماندہ افراد کی بنیادی ضرورتیں پوری نہیں کی جاتیں، وُہ انجام کار تباہی کا نوالہ بن جاتا ہے۔ ایسی قوم کو کبھی حقیقی عروج حاصل نہیں ہوتا۔ وُہ زوال کے گڑھوں میں گرنے سے بچ نہیں سکتی۔

یہ ہم نہیں کہتے، یہ قرآن کا فرمان ہے کہ جس سوسائٹی کے اندر بھی ظلم رائج ہوتا ہے وُہ ہلاک ہو جاتی ہے فرمایا وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرَىٰ إِلَّا وَأَهْلُهَا ظَالِمُونَ ○ پ ۲۰ (ہم کسی بستی کو اس وقت تک تباہ نہیں کرتے جب تک کہ اس کے رہنے والے ظالم نہ ہوں) اور ضروری نہیں ہے کہ سب ظالم ہوں۔ ضروری نہیں کہ پورا معاشرہ ظالموں کا معاشرہ ہو۔ اگر اس کے اندر تھوڑی تعداد بھی ظالموں کی ہے اور اُن کے ظلم و ستم کے خلاف کوئی تحریک نہیں اُٹھتی، ان کے ظلم و ستم کا مقابلہ نہیں کیا جاتا، ان کے ظلم و ستم کے خاتمے کی کوئی صُورت نہیں نکالی جاتی اور لوگ ٹھنڈے پیٹوں ایسی صورتِ حال کو برداشت کر لیتے ہیں، تو تباہی اژدہے کی طرح پھنکارتی اِن کی

سمت لپکے گی۔ پھر گیہوں کے ساتھ گھُن بھی پس جائے گا۔ اور جن لوگوں نے جرُم کیے ہیں وُہ بھی سزا پائیں گے، جن لوگوں نے جُرم نہیں کیے مگر جرائم کا ارتکاب ہوتا دیکھتے رہے، وُہ بھی اس چکّی میں پیس دیے جائیں گے۔

قرآنِ حکیم کی ایک اور آیۂ کریمہ ہے وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً ۚ (اس آزمائش سے ڈرو کہ جس کے اندر صرف وُہ لوگ مبتلا نہیں کیے جائیں گے جنھوں نے تم میں سے ظلم کیا تھا) گویا جب ظلم اس طرح پھیل جائے کہ معاشرے میں ظلم کے خلاف کوئی تحریک نہ ہو، کوئی جذبہ نہ ہو، اس کو بدلنے کے لیے کوئی تڑپ نہ ہو اور اس کے لیے کوئی تنظیم نہ ہو تو ایسا معاشرہ ہمیشہ زوال کا شکار ہوتا ہے اور اسے کائنات کے اندر عروج حاصل نہیں ہوتا۔

جب ایسی قوم شروع میں اپنے مادّی اسباب و وسائل کے ذریعے کسی جگہ قابض ہو جاتی ہے یا عروج پالیتی ہے تو وُہ تھوڑے ہی عرصے میں جھاگ کی طرح بیٹھ جاتی ہے۔ اس لیے کہ اس کے اندر وُہ خصوصیات نہیں ہوتیں جو انسانیت کے لیے نفع بخش ہوں۔ پھر تاریخ اس کی جگہ ایک ایسی طاقت کو اُبھارتی ہے جو اس کو ختم کرکے اس کی جگہ لے لیتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اگر ہم ایسا نہ کریں تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ زمین فساد سے بھر جائے گی۔ اور اس نتیجے کو روکنے کے لیے ہم ظالم قوم کی جگہ دُوسری قوم کو آگے بڑھا دیتے ہیں۔

قرآن کے الفاظ ہیں وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ ۚ (اگر اللہ تعالیٰ کچھ لوگوں کو دُوسرے لوگوں کے ذریعے سے ہٹا نہ دیتا تو زمین فساد سے بھر جاتی) اس لیے ہم نے پیچھے یہ دعوےٰ کیا ہے کہ اسلام تاریخ کو کوئی اندھی بہری طاقت تسلیم نہیں کرتا ہے بلکہ یہ مانتا ہے کہ وُہ قدرت کے منضبط اصولوں کے مطابق کام کرتی ہے۔ وُہ رضائے الٰہی کے تابع ہوتی ہے۔

وُہ اگر کبھی چنگیز اور ہلاکو کا کردار ادا کرتی ہے تو صرف اس لیے کہ ناکارہ ، نااہل اور اپنی حفاظت پر آپ قادر نہ ہونے والے انسانی گروہوں کو سزا دے اور ان کے فاسد خون اور منجمد جسموں میں بھالے ۔ خنجر اور تیر چبھوئے۔

یہ سارے عروج و زوال جو کائنات میں نظر آتے ہیں، یہ بے سبب نہیں ہیں۔ یہ کسی کی قدرت اور کسی کی منصوبہ بندی کے بغیر سامنے نہیں آرہے، بلکہ ایک منصُوبہ بنانے والی عظیم طاقت کے زیر اثر ہیں۔ اور ہم تو یہ کہنے پر بھی قدرت رکھتے ہیں کہ ہم ان دنوں جس دور سے گذر رہے ہیں ، بنی نوعِ انسان نے پچھلی صدی میں انقلابِ فرانس ، پھر اس کے بعد انقلابِ رُوس اور کچھ سال پہلے ستّر کروڑ انسانوں کے ملک چین نے جس معاشی انقلاب کا چہرہ دیکھا ہے یہ بھی خُدائی عمل تھا۔

یہ وقت کا فیصلہ ہے ۔ یہ تاریخ کا فیصلہ ہے ۔ یہ خُدا کا فیصلہ ہے۔ خُدائی قضا و قدر کا فیصلہ ہے کہ یہ ظالمانہ نظام تہ و بالا ہو جائے ۔ یہ استحصال پرستانہ معاشرہ دُنیا میں جہاں کہیں بھی ہے، ختم ہو جائے اور اس کے بجائے ایسا معاشرہ قائم ہو جو انصاف پر مبنی ہو ، عدل پر قائم ہو۔ جس کے اندر لوگوں کی ضروریات عزّت کے ساتھ پُوری ہوں اور جس کے اندر کوئی استحصال کرنے والا نہ ہو۔ اٹھارہویں اور اُنّیسویں صدی کے اندر استحصالی قوّتیں حد سے تجاوُز کر گئی تھیں اور خُدا کی کمزور مخلوق سرمایہ داری اور جاگیرداری کے مسلسل مظالم سے بُری طرح تنگ آچکی تھی۔ یہ بھی تاریخ کا ایک ناگزیر عمل تھا کہ سوشلزم کی تحریک بڑھی اور پھلی پھولی تاکہ سرمایہ داری اور جاگیرداری کے ظالمانہ نظام کی بنیادیں اُکھڑ جائیں۔

اور ہمارا تو دعوٰے ہے کہ جو قوم بھی خُدا کی اس تقدیر کا مقابلہ کرے گی ، خُدا کی اس آواز کے آگے رکاوٹیں کھڑی کرے گی ، تاریخ کی رفتار کا منہ موڑنا چاہے گی، تاریخ کے پاؤں میں بیڑیاں ڈالنے کی کوشش کرے گی ، وقت کے

دھارے سے نبرد آزما ہو گی، وُہ خس و خاشاک کی طرح بہ جائے گی اور اس کائنات کے اندر کبھی عروج نہیں پا سکے گی۔ یہ قُدرت کا نظام ہے، جس کو اب کوئی طاقت مٹا نہیں سکتی۔ یہ سوال البتہ باقی ہے کہ جب تاریخ اس مرحلے پر پہنچے گی کہ کائنات عدل و انصاف سے بھر جائے اور ہر طرح سے استحصال ختم ہو جائے تو پھر ارتقا کا قافلہ کدھر جائے گا؟ کیا اس وقت یہ سمجھا جائے گا کہ اَب حرکت کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے اور ارتقائی کارروائی ختم ہو گئی ہے اور وقت کا دھارا منجمد ہو جائے گا؟ ایسا بالکل نہیں ہو گا۔ آدمیت و انسانیت کو اور آگے بڑھنا ہے اور اس منزل کی سمت سفر پیہم ہونا ہے، جسے اسلام آخری منزل قرار دیتا ہے اور جو موت کے بعد آنے والی زندگی تک لے جاتی ہے۔ ایسی زندگی تک جہاں انسان کو جسم کی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ رُوح کی ضرورتوں کا بھی احساس ہوتا ہے۔ یہ زندگی بھی آئے گی اور یہ دور بھی آئے گا۔

خُدا کرے مُسلمان اس قابل ہو سکیں۔ خُدا کرے ہم اس قابل ہو سکیں کہ ہم سب سے پہلے موجودہ دَور کے تقاضوں کا ساتھ دیں، اپنے معاشرہ میں عدل و انصاف قائم کریں اور اس کا رستہ روکنے کی فضول کوشش نہ کریں۔ پھر ہم کائنات کے اس ارتقائی سفر کو اس مقام پر لے آئیں گے جہاں سے اسلام دُوسری دُنیا کی سمت رہنمائی کرتا ہے۔

قوموں کے عروج وزوال میں تاریخ کا عمل

تاریخ کی اہمیت محتاجِ وضاحت نہیں کہ یہی وہ ایک علم ہے جس کی کوکھ سے دنیا کے تمام علوم نے جنم لیا ہے اور وُہ ترقی و فروغ کی راہ پر گامزن ہوئی ہے۔ اسی حقیقت کے پیشِ نظر نہ صرف پاکستان بلکہ عالمِ اسلام کے عظیم مفکّر علامہ اقبال نے کہا تھا کہ جس طرح فرد کی زندگی میں حافظہ کی اہمیت ہے کہ اگر یہ کم ہو جائے تو اس کی زندگی بے معنی ہو جاتی ہے، اسی طرح ایک قوم کی زندگی میں تاریخ کی اہمیت ہے اگر تاریخ کسی قوم سے گم ہو جائے تو اس قوم کی زندگی بھی بے معنی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ قرآنِ حکیم نے تاریخ پر نظر ڈالنے کے لیے بار بار زور دیا ہے اور تاریخ کو انتہائی اہمیت دی ہے۔ جو لوگ قرآنِ حکیم سے شغف رکھتے ہیں، انہوں نے ایک لفظ اس میں پڑھا ہو گا جسے آیت کہا جاتا ہے اور جس کی جمع آیات ہے۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ آیات سے مراد قرآنِ حکیم میں ان آیتوں سے ہے جن سے قرآنِ حکیم کی سُورتیں مُرکّب ہیں لیکن جن لوگوں کو اس زندہ کتاب سے گہرا شغف ہے اور جو اس سے اچھی طرح مستفیض ہُوتے یا اس سے فیض حاصل کرنے کی کوشش میں رہتے ہیں انہیں معلوم ہو گا کہ آیات کا لفظ قرآنِ حکیم میں چار مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ایک تو یہ لفظ ان آیتوں کے لیے استعمال ہُوا جن سے قرآنِ حکیم کی سورتیں مُرکّب ہیں اور جن سے مراد احکام الٰہی ہیں جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے کہ اِذَا تُتْلٰی عَلَیْہِ اٰیَاتُنَا قَالَ اَسَاطِیْرُ

الاوّلِیْنَ (پارہ ۲۹ سورۃ قلم آیت ۱۵) جب ہماری آیتیں اس کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو اگلے وقتوں کے افسانے ہیں۔

دُوسرے یہ لفظ ان معجزات کے لیے استعمال ہُوا ہے جو انبیاء علیہم السلام لے کر آئے۔ اور یہ معجزات اس بات کی دلیل اور علامات ہوتے ہیں کہ وُہ واقعی فرمانروائے کائنات کے نمائندے ہیں اور ان کے اعلان میں کسی طرح کی غلط بیانی کا شائبہ تک نہیں جیسا کہ حضرت موسیٰؑ کو حکم ہوتا ہے۔

اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰیٰتِیْ وَلَا تَنِیَا فِیْ ذِكْرِیْ (پ ۱۶، سورہ طٰہٰ۔ آیت ۴۲) اے مُوسٰے جا! تو اور تیرا بھائی میری نشانیوں، میرے عطا کردہ معجزات کے ساتھ اور دیکھو! تم میری یاد میں تقصیر نہ کرنا۔

تیسرے اس لفظ سے مراد اس علامت یا نشانی کے ہیں جو کسی چیز کی طرف رہنمائی کرے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے کہ

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ (پارہ ۲۲، سورہ سبا، آیت ۱۹) یقیناً اس میں ہر اس شخص کے لیے نشانیاں ہیں جو بڑا صابر و شاکر ہے۔

اور چوتھے ان دلائل کے لیے جو زمین و آسمان اور آفاق و انفس کے ہر گوشے میں موجُود ہیں اور جو خدا کی قدرت و حکمت، اس کی توحید اور اس کے قانونِ جزا و سزا کی گواہی دے رہی ہیں اور یہی وُہ آیات ہیں جن کو آثارِ کائنات اور آیاتِ تاریخ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ وہ آیات ہیں یعنی آثارِ کائنات اور آیاتِ تاریخ جن پر غور کرنے کی انسان کو بار بار دعوت دی گئی ہے۔ ان سے فائدہ اٹھانے پر زور دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ کون لوگ ان سے کس طرح فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔

"اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ (پ ۲۵۔ سورہ جاثیہ، آیت ۱۳) اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو غور و فکر کرتے ہیں" یعنی جو لوگ آثارِ کائنات

اور آیاتِ تاریخ پر غور کرتے ہیں وہ اس میں اپنے لیے بڑی مفید مطلب باتیں پاتے ہیں اور اپنی زندگیوں کے سُدھار اور سنوار کے لیے ان کے اندر ان کے لیے بڑا سامان ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ان تمام آیات کا ایک دُوسرے کے ساتھ گہرا تعلق ہے اور جس قوم نے ان آیات پر غور کیا ہے، ان کو اپنی زندگی کی اساس بنایا ہے اس نے کامل کامیابی حاصل کی ہے اور جس قوم نے ان میں سے کسی ایک آیت کو اپنایا ہے اس نے بھی ایک شعبے کی حد تک جزوی طور سے کامیابی حاصل کی ہے لیکن وُہ کامل کامیابی نہیں جس کے حصول کے لیے انسان کی تخلیق کی گئی ہے اور دنیا میں اسے بھیجا گیا ہے۔ جیسے مغربی اقوام نے ایک طرح کی آیات پر غور کیا ان میں تدبّر کیا، علم وفنون میں مہارت حاصل کی، کائنات کے اسرار و رموز کا احاطہ کرنے کی کوشش کی تو ان کی زندگی میں مادّی لحاظ سے آسانیاں پیدا ہُوئیں، آسائشیں آئیں۔ ان کو تفوّق و برتری حاصل ہُوئی اور بہُت مختصر وقت میں ان کے نام کا ڈنکا چہار دانگِ عالم میں بجنے لگا۔ لیکن مغربی اقوام نے آیاتِ تاریخ کو نظر انداز کیا، تاریخ کے اسباق کو پس پشت ڈالا، قوم کے عروج وزوال کی داستانوں سے اپنے لیے عبرت پزیری کا سامان بہم نہ پہنچایا یہ نہ دیکھا کہ کوئی قوم بام عروج پر کس رویۂ زندگی سے پہنچتی ہے اور کس طرزِ حیات سے قعرِ مذلّت میں جا گرتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ آہستہ آہستہ ان کے اندر انحطاط پیدا ہونے لگا جیسا کہ اس عظیم برطانیہ کی حماقت ہمارے سامنے ہے جس کی قلمرو میں سُورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ ہاں اشتراکی ملکوں نے آیاتِ تاریخ پر ایک حد تک غور کیا، تاریخ کے فلسفے اور تاریخ کے سبق کو ایک حد تک سمجھنے کی کوشش کی جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ مغربی اقوام فکری میدان میں ان سے شکست کھانے لگیں اور اشتراکی ملکوں کو کم از کم اس میدان میں غلبہ حاصل ہونے لگا۔ ہر چند یہ غلبہ ایک

طبقۂ انسانی تک محدود ہے اور اس کے اندر وسعت نہیں جو کائناتِ انسانی پر محیط ہو سکے لیکن جیسا کہ ہمارے سامنے ہے مغربی اقوام کی کامیابی کی طرح یہ کامیابی بھی جزوی ہے۔ کیونکہ اس میں بھی وُہ گہرائی اور گیرائی نہیں جو مکمل کامیابی حاصل کرنے کے لیے شرطِ لازم کی حیثیت رکھتی ہے۔ مکمل کامیابی صرف اس قوم کو حاصل ہو سکتی ہے اور حاصل ہوتی ہے جو آیاتِ الٰہی کے ہر پہلو پر نظر رکھے، ان کو اپنائے اور ان کے مطابق اپنی زندگی کی نہج استوار کرے کیونکہ اسی طرح مادّی اور روحانی زندگی باہم مربوط ہو سکتی ہے۔ زندگی کے کسی حصے میں بھی خلا نہیں رہ سکے گا اور ایک کامل اجتماعی زندگی ظہور میں آئے گی جو کائناتِ انسانی کی فلاح کے لیے ازبس ضروری ہے۔

سورہ معارج کی آیت ٦ میں انسانی تاریخ کے پچاس ہزار برس کو ایک دن قرار دیا گیا ہے۔ اب اگر کوئی کہتا ہے کہ قوموں کے اعمال نیک و بد کا فوری نتیجہ کیوں برآمد نہیں ہوتا تو یہ اس کی بھول ہے۔ کسی قوم کی غلطی کی سزا فوراً کیوں نہیں مل جاتی یہ اس کی حقائق سے لاعلمی ہے۔ کسی معاشرے کے اعمالِ حسنہ کا شجر فوری طور پر برگ و بار کیوں نہیں لاتا تو یہ اس کی نادانی ہے۔ اس کی مثال یوں ہے جیسے کوئی شخص کسی جوہڑ میں ایک پتھر پھینکتا ہے تو اس میں بڑا ارتعاش پیدا ہوتا ہے، بڑی لہریں اٹھتی ہیں اور دیکھنے والا یہ سمجھ لیتا ہے کہ پتھر پھینکنے کا نتیجہ برآمد ہوا۔ لیکن اگر دریا رواں ہو، سمندر موجیں مار رہا ہو اور اس میں پتھر پھینکا جائے تو بعض اوقات کسی کو محسوس بھی نہیں ہوتا کہ اس کا کیا نتیجہ نکلا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ لہریں ضرور پیدا ہوتی ہیں، ارتعاش ضرور ہوتا ہے۔ یہ سوال دُوسرا ہے کہ وہ ارتعاش نظر آتا ہے یا نہیں آتا۔ قوموں کے اعمال جب جمع ہوتے رہتے ہیں تو پھر ایک وقت آتا ہے کہ ان کی مُدتِ مہلت تمام ہو جاتی ہے اور وُہ قومیں اپنے اعمال کے نتیجے میں قعرِ مذلت میں پھینک دی جاتی ہیں ——— سورۂ العصر کے اندر اللہ تعالےٰ نے تاریخ، وقت اور زمانے کی

قسم کھاتے ہوئے جو باتیں بیان کی ہیں وُہ یہ ہیں۔

"وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ہ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحَاتِ "

زمانے کی قسم! انسان درحقیقت بڑے خسارے میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور کام کو جس صحت اور جس طریقے سے کرنا چاہیے اور جو طریقہ اس کے لیے مہیا ہو سکتا ہے اس کے ساتھ انجام دیتے رہے۔

پہلی شرط یہ ہے کہ وُہ ایمان رکھتے ہوں! ایمان کے معنی ہیں وُہ یقین وہ کامل طمینان وُہ کامل اقرار جو عمل سے پہلے پیدا ہوتا ہے جب تک کامل درجے کا بھروسہ کامل درجے کا اقرار اور کامل درجے کا یقین دلوں کے اندر پیدا نہ ہو کامیابی کا دروازہ کسی کے لیے نہیں کھل سکتا۔ شک کا اگر ایک کانٹا بھی کسی کے دل میں چُبھ رہا ہے تو اس کو اپنے اُوپر موت کا فیصلہ صادر کرنا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ یہ دولت، ایمان کی دولت، یقین کی دولت اسی قوم اور اسی فرد کو حاصل ہوتی ہے جس کا کوئی نصب العین ہو، مقصود ہو اور کوئی مدعائے زیست اس کے پیشِ نظر ہو۔ کوئی فرد جو کوئی عقیدہ نہ رکھتا ہو، کوئی یقین نہ رکھتا ہو ایسی زندگی نہیں گزار سکتا جسے بامقصد زندگی کہا جا سکے! اس کی زندگی اس شُتر بے مہار کی طرح ہوگی جس کے سامنے کوئی منزل نہیں۔ وُہ کدھر جا رہا ہے؟ کیوں جا رہا ہے؟ کوئی ہدف معین نہیں۔ ایمان، یقین اور عقیدے کی حیثیت ایسی ہے جیسے بیج کہ اگر بیج بویا جائے تو اس کے نتیجے میں درخت پیدا ہوتا ہے عقیدہ ہو۔ یقین ہو۔ ایمان ہو تو اس کے نتیجے میں عمل پیدا ہوتا ہے۔ گویا اسے ہم وُہ ارادہ بھی کہہ سکتے ہیں جو کسی کام کے کرنے سے دماغ میں پیدا ہوتا ہے۔ اگر کسی کا دامن دولتِ ایمان نعمتِ یقین اور متاعِ عقیدۂ صحیح سے خالی ہے یا ایمان ہو، یقین ہو، عقیدہ ہو اور صحیح نہ ہو تو جو عمل پیدا ہوگا وُہ بھی صحیح نہیں ہوگا۔ تو سب سے پہلے کسی قوم، کسی وجود، کسی رُوح کے لیے جو کامیابی کی متمنّی اور متلاشی ہے یہ ضروری ہے کہ وُہ اپنے کاشانۂ دل کو شمعِ

ایمان سے فروزاں کرے۔ پھر جس درجہ کا ایمان و یقین اسے حاصل ہوگا اسی درجے کے کام اس سے سرانجام پائیں گے اور اسی درجے کی کامیابی سے وُہ ہمکنار ہوگی۔

تاریخ کے ضمن میں یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ اللہ تعالےٰ نے اپنے کلامِ پاک میں جن چیزوں کی قسم کھائی ہے ان میں ایک تاریخ بھی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

"وَالعَصرِ"۔ زمانے کی قسم۔ یہ زمانے کا لفظ ماضی یعنی گزرے ہوئے زمانے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور حال یعنی گزرتے ہوئے زمانے کے لیے بھی اور اس حقیقت سے عام طور پر لوگ واقف ہیں کہ ہر آن آکر مستقبل کو حال اور جا کر حال کو ماضی بنا رہی ہے یہاں زمانے کی قسم کا اصل مفہوم وہی ہے جس کو مولانا سید سلیمان ندوی نے اس آیت کے ترجمے میں واضح کیا ہے۔ یعنی یہ کہ زمانہ مع اپنی پوری انسانی تاریخ کے گواہ ہے۔ گویا اللہ تعالےٰ نے تاریخ کی شہادت دلائی ہے۔ تاریخ کو گواہ ٹھہرایا ہے اور جو دعویٰ آگے کیا اس کے لیے دلیل کے طور پر تاریخ کو پیش کیا۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ تاریخ کوئی اندھی بہری اور گونگی قوت نہیں ہے۔ محض جذباتی عمل سے اس کے اندر انقلاب پیدا نہیں ہوتے بلکہ یہ ان قوانین کی پابند ہے جنہیں سُنَنِ الٰہیہ کہتے ہیں یعنی اللہ تعالےٰ کی سنتیں۔ اس کے اندر جو قانون کارفرما ہے وہ اللہ تعالےٰ کا بنایا ہوا ہے اور اس میں وُہ کسی سے رعایت نہیں کرتا۔ جو قوم، جو جماعتیں اور جو افراد اس کے قانُون کی پابندی نہیں کرتے وُہ زوال کا شکار ہو جاتے ہیں۔

" سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِي قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا" (سورہ فتح۔ آیت ۲۳)

یہ اللہ کا طریقہ ہے، اللہ کی سنت ہے جو پہلے ہی سے آرہی ہے اور تم اللہ کے طریقے، اللہ کی سُنت میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے"۔

دُوسرے لفظوں میں تاریخ خُدا کے عمل کا نام ہے اور اس حقیقت سے کے مجالِ انکار ہے کہ خُدا کے قول و عمل میں تضاد ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اس لیے آیاتِ الٰہیہ جو اس

کے اقوال ہیں، ان کو آیاتِ تاریخ جو اسکے اعمال ہیں بھی کہا جا سکتا ہے اور کہا جاتا ہے
یہ قانونِ الٰہی ہے کہ جب کوئی قوم ان لگے بندھے ضابطوں کی پابندی کرتی ہے وہ
عروج پر پہنچتی ہے اور جب ان ضابطوں کے مطابق عمل کرنا چھوڑ دیتی ہے، انکی پابندی
سے دامن چھڑا لیتی ہے تو زوال اس کا مقدر ہو جاتا ہے۔ اس لیے جو قومیں تاریخ سے
لڑنے کی کوشش کرتی ہیں کامیابی ان کا حصّہ نہیں بنتی۔ اس لیے ضروری ہے کہ ان ضابطوں
کو دیکھا جائے، ان کا عرفان حاصل کیا جائے اور ان کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالا جائے
جو زمانے میں، وقت میں، تاریخ میں روح کی حیثیت سے جاری و ساری ہیں۔ آپ
قرآنِ حکیم کی اس مختصر سی سورت کو دیکھیں جس میں اللہ تعالےٰ نے تاریخ کی قسم کھائی
ہے کہ کامیابی کس قوم کے ساتھ پیمان باندھتی ہے۔ وہ کون سے انسان ہوتے ہیں
اور کونسا انسانی گروہ ہوتا ہے جس کو اس مسندِ شرف پر بٹھایا جاتا ہے۔ دوسرے
لفظوں میں اسی سورت میں اس کی ضد بھی واضح کر دی کہ کس قوم کو زوال سے دوچار
ہونا پڑتا ہے، وہ کونسے انسان ہوتے ہیں اور کونسا انسانی گروہ ہوتا ہے جس کے
حصّے میں یہ پستی، یہ ذِلّت آتی ہے۔ جس طرح فرد کے کسی عمل کا ایک نتیجہ برآمد ہوتا
ہے اسی طرح قوم کے عمل کا بھی نتیجہ نکلتا اور ظاہر ہوتا ہے۔ بعثتِ محمدیہ کے بعد سے
فرد کی عمر مختصر ہوتی ہے۔ عموماً پچاس ساٹھ سال۔ بعض اوقات اس کے اعمال
کے نتائج اس کی زندگی میں بھی ظاہر ہوتے ہیں لیکن قوموں کی زندگی میں پچاس ساٹھ
سال کا عرصہ نہایت مختصر وقفہ ہے۔ وہ جو اللہ تعالےٰ نے کہا ہے کہ انسانی تاریخ
میں اس کے فیصلے دنیا کی گھڑیوں اور جنتریوں کے لحاظ سے نہیں ہوتے، تمہارے نزدیک
جو ایک ہزار برس کی تاریخ ہے، وہ اللہ تعالےٰ کے ہاں گویا ایک دن کا کام ہے۔

يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ
مِمَّا تَعُدُّونَ (پ۲۱۔ سورہ سجدہ آیت ۵) وہ آسمان سے زمین تک دنیا کے معاملات کی تدبیر کرتا

ہے اور اس تدبیر کی روداد اوپر اس کے حضور جاتی ہے ایک ایسے دن میں جس کی مقدار تمہارے شمار سے ایک ہزار سال ہے۔

دُوسری جگہ فرمایا۔ وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ اَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (سورہ حج آیت ۴۷)

یہ لوگ عذاب کے لیے جلدی مچا رہے ہیں۔ اللہ ہرگز اپنے وعدے کے خلاف نہ کرے گا مگر تیرے رب کے ہاں کا ایک دن تم لوگوں کے شمار سے ہزار برس جیسا ہوا کرتا ہے۔

اور ایک جگہ اصحاب کہف کا واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ

اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا۔ (پ۱۵۔ سورہ کہف آیت ۹)

تو اے مخاطب کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ اصحابِ کہف یعنی وسیع غار والے اور اصحابِ رقیم یعنی کتبے والے ہماری کوئی بڑی عجیب نشانیوں میں سے تھے"۔

دُوسری شرط، دُوسری منزل اور دُوسری صفت ہے کہ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ۔ یعنی نیک اعمال کرتے رہے۔ جس کام کو حسنِ صحت اور جس طریقے کے ساتھ کرنا چاہیے اور جو طریقہ اس کے لیے سچا ہو سکتا ہے اس کام کو اس کے ساتھ انجام دینا عملِ صالح ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی کے نزدیک ایمان و عملِ صالح کی مثال اقلیدس کے اصول و اشکال کی ہے۔ ایمان کی حیثیت اصولِ موضوعہ اور اصولِ متعارفہ کی ہے جن کو صحیح مانے بغیر اقلیدس کی شکلوں کا ثبوت محال ہے۔ لیکن اگر صرف اصولِ موضوعہ اور اصولِ متعارفہ کو تسلیم کر لیا اور ان کے مطابق شکلوں کا عمل نہ کیا جائے تو فنِ تعمیر، ہندسہ اور جسامت و پیمائش میں یہ فن ایک ذرہ کارآمد نہیں ہو سکتا اور نہ اس سے انسان کو وُہ فائدے حاصل ہو سکتے ہیں جو اس فن سے اصل مقصود ہیں۔ اسی طرح کوئی جماعت، کوئی قوم ایمان تو رکھتی ہے یقین کی شمع تو اس کے دل میں روشن ہے لیکن وُہ بے عملی یا بد عملی کا شکار ہے تو وہ منزلِ مقصود پر نہیں پہنچ سکتی زمانے کی پوری تاریخ

اس پر شاہدِ عادل ہے کہ انہیں افراد اور قوموں پر فوز و فلاح اور فتح مندی و کامیابی کے دروازے کھلے ہیں جنہیں ربّانی حقائق کا یقین تھا اور اس یقین کے مطابق ان کے عمل بھی نیک ہوتے رہے۔

اس کے بعد کیا انسان کا کام ختم ہو گیا اور اس نے دُنیا اور آخرت کی تمام نعمتوں کو اپنی جھولی میں بھر لیا؟ قرآن کی عالمگیر صداقت کہتی ہے کہ نہیں۔ بلکہ ان دو منزلوں کے بعد دو منزلیں اور باقی ہیں۔ اپنی ہمت تو آزما لو کہ ان کے لیے تمہارے توے تیار ہیں یا نہیں۔ تمہاری کمر بہت مضبوط ہے یا نہیں۔ اگر نہیں ہے تو ممکن ہے کہ یہ دو منزلیں تمہارے لیے سود مند نہ ہوں فرمایا کہ تیسری منزل، تیسری صفت اور تیسری شرط ہے وَ تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ۔ (اور ایک دُوسرے کو حق کی نصیحتیں کرتے رہے) یعنی ہر فرد صرف خُود ہی حق پرستی اور راست بازی اور عدل و انصاف پر قائم رہنے پر اکتفا نہ کرے بلکہ دُوسروں کو بھی اس طرف عمل کی تلقین کرے، دُنیا میں خُدا کی سچائی کا پیغام پہنچاتے اسکا ذہن مشنری اور تبلیغی ہو اور اس کے اندر یہی جذبہ ہو اپنے یقین کی جو شمع اس نے روشن کی ہے اس سے دُوسرے چراغ روشن کرنے کی اس کے اندر تڑپ ہو۔ اس کے لیے وہ جد و جہد کرے۔ اگر یہ رُوح کسی معاشرے اور کسی قوم میں نہ رہے تو وُہ گھاٹے سے نہیں بچ سکتی۔

اگر توفیقِ الٰہی انسان کی دستگیری کرے تو پھر آخری منزل آتی ہے۔ وُہ منزل ہے وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔ (اور صبر کی تلقین کرتے رہے) یعنی حق کی پیروی اور حق کی حمایت میں جو مشکلات پیش آئیں اور اس راہ میں جن تکلیفوں، جن مشقتوں اور جن نقصانات سے انسان کو سابقہ پڑے کیونکہ حق کا حال یہ ہے کہ اس کی راہ میں کوئی قدم نہیں اُٹھ سکتا جب تک وُہ قربانیوں کے لیے نہ ہو۔ چنانچہ کامیابی اور فتح مندی حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس چوتھی شرط پر بھی عمل کیا جائے، ایک

دُوسرے کو اس راہ میں ثابت قدم رہنے کی تلقین کی جائے اور ایک فرد دُوسرے فرد کی ہمت بندھاتا رہے کہ وُہ ایسے حالات میں صبر و برداشت کے پیمانے کو لبریز نہ ہونے دے۔ صبر یا مردی، دل کی مضبوطی اور اخلاقی جرأت اور ثباتِ قدم کا نام ہے۔ یعنی مشکلات و مصائب کے باوجُود اپنے نصبُ العین پر ڈٹے رہنا اور دل کو ہلکا نہ ہونے دینا۔ اسی لیے عربی زبان میں صبر کے مادّہ سے جتنے الفاظ بنے ہیں ان سب میں یہ مفہوم پایا جاتا ہے گویا یہ چار باتیں ایسی ہیں تاریخ جن پر گواہ ہے کہ انسان کی انفرادی زندگی میں بھی اور اجتماعی زندگی میں بھی کامیابی کیلئے شرط ہیں۔

پہلی، یقین۔

دُوسری، یقین کے نتیجے میں عمل مسلسل۔

تیسری، یقین کو عام کرنے کی جدوجہد۔

اور چوتھی، اس پر ثابت قدمی۔

جس قوم نے ان صفات کو اپنایا ہے اس قوم نے تاریخ میں ترقی حاصل کی ہے اور جس قوم نے ان صفات کا دامن چھوڑ دیا وُہ گھاٹے میں رہی ہے اور زوال کا شکار ہوئی ہے خواہ وُہ دنیوی زندگی ہو خواہ وُہ رُوحانی اور خواہ دُنیاوی اور رُوحانی دونوں زندگیاں ہوں، دونوں اعتبار سے جس قوم کا بھی جائزہ لیا جاتا ہے یہی نقشہ اس کے اندر نظر آتا ہے۔ لہٰذا ہمارے لیے ضروری ہے اور خاص طور پر ہمارے پڑھے لکھے طبقہ کے لیے نہایت ضروری ہے کہ چار صفات کا شعور اپنے اندر پیدا کرے اور ان کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالے۔

آج ہم پاکستان کی قومی تاریخ میں ایک نازک موڑ پر کھڑے ہیں۔ ہم ابھی تک اپنے آپ کو سنبھالا دینے کی سعی میں مصروف ہیں۔ پاکستان کی بقا کی جنگ کر رہے ہیں۔ ہمارے وطن کا نصف سے زیادہ حصّہ ہم سے علیحدہ ہو چکا ہے اور جو باقی ہے اسے

ہمیں بچانا ہے، اسے بنانا ہے اور اسے آگے بڑھانا ہے اور اس کے لیے وہ سارے تاریخی عوامل کام کر رہے ہیں جو کسی بھی قوم کے عروج و زوال کے لیے انتہائی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس موڑ پر ہمیں تمام چیزوں کو بھلا کر پاکستان میں ایک قوم کی تشکیل کرنی ہے اور اہلِ پاکستان کو ایک قوم بنانا ہے اور ان تمام عناصر کو شکست دینا ہے جو مختلف لبادوں میں پاکستان کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کی فکر میں ہیں۔ اگر اس موقع پر ہم غافل رہے اور تاریخ کے اتار چڑھاؤ پر نظر نہ رکھی تو یاد رہے کہ ؎

فطرت افراد سے اغماض تو کر لیتی ہے　　کبھی کرتی نہیں ملّت کے گناہوں کو معاف

فرد کا ذاتی قصور تو معاف ہو سکتا ہے کیوں کہ اسکا اور اس کے رب کا معاملہ ہے۔ لیکن جب کوئی ملّت گناہ کرتی ہے، جب کوئی قوم من حیث القوم کسی برائی میں ملوّث ہوتی ہے، جب کسی جماعت سے کوئی بھاری غلطی سرزد ہوتی ہے تو پھر اسے تاریخ کے کٹہرے میں کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ پھر اسے تاریخ کے انتقام سے کوئی نہیں بچا سکتا اور وہ تاریخ کا انتقام کیا ہے، خود خدا کا انتقام۔ کیونکہ تاریخ ان ضابطوں کا نام ہے جو اللہ تعالےٰ نے خود بنائے ہیں۔

ہم نے اکثر پڑھا اور سنا ہے کہ مشیّتِ الٰہی بھی کوئی چیز ہے۔ کسی قوم کو عروج حاصل ہو یا کسی قوم کے حصّے میں زوال آئے تو اس کا ایک آسان جواب یہ دیا جاتا ہے کہ مشیّتِ الٰہی یہی تھی۔ یعنی مشیّتِ الٰہی تھی کہ زوال حاصل ہوا اور مشیّتِ الٰہی تھی تو عروج مل گیا۔ اس طرح افراد کے معاملے میں کہا جاتا ہے کہ جب کسی کو اقتدار ملے، عروج حاصل ہو، وہ ترقی پذیر ہو تو وہ بھی مشیّت ہے۔ جب تنزل ہو اور قعرِ گمنامی میں جا پڑے تو وہ بھی مشیّت ہے۔ دراصل یہ بھی قرآنِ حکیم کی اس آیت کا مفہوم ہے جس میں ارشاد ہوتا ہے۔

"وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ"　　(اے اللہ تو جسے چاہتا ہے عزّت بخشتا ہے

اور جسے چاہتا ہے ذلت دے دیتا ہے۔

یہاں دو ایک باتیں قابلِ غور ہیں۔ کیا تاریخ میں ہونے والے ہر واقعہ کی، کائنات میں ظہور پذیر ہونے والے ہر حادثے کی مشیّت الگ الگ ہے یا ایک ہی ہے؟ ہم چونکہ موحد ہیں۔ ہمارا ایمان توحید پر ہے۔ ہم خُدائے واحد کو مانتے ہیں اس لیے ہمارے نزدیک کائنات میں ظہور پذیر ہونے والے ہر واقعہ اور ہر حادثے کی مشیّت ایک ہے۔ اس کے برخلاف اگر ہم نے بہت سے خُداؤں کو مانا ہوتا اور شرک کی راہ اختیار کی ہوتی تو کائنات میں پیش آنے والے واقعات کی مشیّتیں الگ الگ ہوتیں پھر ہمارا پختہ یقین ہے کہ ہر واقعہ میں اتنی ہم آہنگی ہے، اتنی وحدت ہے اور اس کے اندر اتنا ربط ہے کہ ایک ہی خُدا کا قانون اس میں اسی طرح جاری و ساری ہے جس طرح بدن میں لہو جاری و ساری ہوتا ہے۔ ایک ہی خدا کی مشیّت ہے جو ہر جگہ جلوہ فرما ہے اور اس کے پیچھے بھی ایک ہی قانون ہے جو اس کو منضبط کیے ہوئے ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ اگر مشیّتِ الٰہی ہو، اللہ تعالےٰ چاہے تو ظالموں پر کرم فرما دے اور ظالم قوم کو ہمیشہ ترقی دے۔ وُہ ہر چیز پر قادر ہے۔ چاہے تو مظلوموں کی فریاد کی شنوائی نہ ہو۔ وُہ ہمیشہ پستے ہی رہیں اور ان کی آہوں اور نالوں کے نتیجے میں کبھی کوئی انقلاب برپا نہ ہو۔ لیکن نہیں وُہ ایسا نہیں کرتا کیونکہ وُہ اگر حاکم ہے تو حکیم بھی ہے۔ ہر چند وُہ سب کچھ کر سکتا ہے مگر وُہ کرتا وہی ہے جو اس کی مشیّت کا تقاضا ہوتا ہے، عدل کا تقاضا ہوتا ہے، انصاف کا تقاضا ہوتا ہے اور جو اس کی حکمت کا تقاضا ہوتا ہے۔ قوموں کے عروج و زوال کے سلسلہ میں اس نے جو اپنی مشیّت بیان فرمائی ہے اس میں ان سب سے بڑی اور سرِعنوان بات یہی ہے کہ جس سوسائٹی میں ظلم پیدا ہو جائے ظلم کا دَور دورہ ہو جائے اور جو معاشرہ ظلم پر مبنی ہو وہ کبھی سرسبز و شاداب نہیں ہو سکتا۔ وُہ کبھی نہیں پھل پھول سکتا۔

سوال یہ ہے کہ ظلم نام کس چیز کا ہے۔ ظلم کے معنی وَضعُ الشَّئِ فِی غَیرِ مَحَلِّه کے ہیں یعنی جو بات جس جگہ ہونی چاہیے وہاں نہ ہو بے محل ہو تو لغت میں اس حالت کو ظلم کہیں گے۔ اس لیے قرآنِ پاک نے شرک کو ظلمِ عظیم کہا ہے کیوں کہ اس سے زیادہ کوئی بے محل بات نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ پیشانی اللہ کے حضور جھکنے اور سجدہ کرنے کے لیے بنی ہے۔ جب یہ بندوں کے آستانوں پر جھکنے لگے اور بندوں کے درباروں میں سجدہ ریز ہونے لگے تو یہ ظلمِ عظیم ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کسی چیز کا اپنی صحیح جگہ میں نہ ہونا ایک ایسی حالت ہے جو حقیقت عدل کے عین منافی ہے۔ اس طرح یہ ہاتھ غریبوں مسکینوں اور کمزوروں کی دستگیری کے لیے بنے ہیں اب اگر یہ ہاتھ غریبوں، مزدوروں اور بے کسوں پر دراز ہونے لگیں تو یہ ظلم ہے۔ کیونکہ ان سے وہ کام لیا جاتا ہے جس کے لیے یہ بنے نہیں ہیں۔ یہ ظلم کی حقیقت ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ظلم سوسائٹی میں پیدا کس طرح ہوتا ہے۔ اس کے لیے مختلف طبقوں کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا سب سے پہلے ظلم کا اظہار جس طبقہ سے ہوتا ہے اس کو قرآنِ حکیم مُترَفِین کہتا ہے جو خوشحال ہوتے ہیں، صاحب جاہ و حشمت، صاحب مال و دولت اور صاحب اثر ہوتے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جو ہر اچھے انقلاب کا راستہ روکتے ہیں اور عیش و عشرت کی زندگی میں پڑ کر سوسائٹی میں فساد پیدا کرتے ہیں یہ خود بے عمل و بدعمل ہوتے ہیں دوسرے لوگوں اور سوسائٹی کو بھی بے راہ کرتے ہیں قرآنِ حکیم ان کے متعلق کہتا ہے

"وَاِذَا اَرَدْنَا اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا" (پ ۱۵ سورہ بنی اسرائیل، آیت ۱۶)

اور جب ہمیں منظور ہوتا ہے کہ کسی بستی کو ہلاک کریں تو ایسا ہوتا ہے کہ اس بستی کے خوشحال لوگوں کو حکم دیتے ہیں یعنی وحی احکام حق پہنچا دیتے ہیں پھر وہ بجائے اس کے کہ اسکی تعمیل کریں نافرمانی میں سرگرم ہو جاتے ہیں پھر ہم اس کی اینٹ

سے اینٹ بجا دیتے ہیں "

گویا فساد کا آغاز خوشحال اور اچھے کھاتے پیتے طبقہ سے ہوتا ہے۔ جس کی دستبرد اور تباہی و ہلاکت خیزی سے پھر کوئی نہیں بچتا۔ اس لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے اس طبقہ کے رویّہ پر نظر رکھی جائے اور اس کے ذہنی فساد کو اس حد تک کم کر دیا جائے کہ وُہ دوسروں پر ظلم و زیادتی کرنیکے قابل نہ رہے۔ یہ وُہ عین تاریخی حقیقت ہے جس کا قرآنِ حکیم نے ہمیں سبق دیا ہے اور جب اس طبقہ سے وُہ ذرائع و وسائل چھین لیے جاتے ہیں جن کی مدد سے وُہ دوسروں پر ظلم ڈھاتا، زیادتی کرتا اور ان کی حق تلفی کے جرائم کے ارتکاب میں ملوّث ہوتا ہے تو پھر وُہ مساوات پیدا ہوتی ہے جس کا اسلام نے ہمیں درس دیا ہے۔ اور جس پر کاربند رہنے کی ہمیں سخت تاکید کی ہے۔ اگر کوئی قوم اس پر عمل پیرا نہیں ہوتی اور اسکے اندر ایسا طبقہ پرورش پاتا رہتا ہے جو فساد پیدا کرتا رہے، ظلم ڈھاتا رہے، عیش و عشرت کی محفلیں آراستہ کرنے میں لگا رہے تو ظلم کا دائرہ پھیلتا ہے اور ظالموں کا ہاتھ روکنے والا کوئی نہیں ہوتا تو پھر ظلم پھیلتا ہی جاتا ہے اور مظلوم پھیلتے ہی چلے جاتے ہیں کوئی آواز ظلم کے خلاف نہیں اُٹھتی۔ کوئی صدائے احتجاج بُلند نہیں ہوتی۔ اسے سب کے سب ٹھنڈے پیٹوں برداشت کر لیتے ہیں تو پھر یہی ظلم ظلمات بن جاتا ہے یعنی اندھیر ہو جاتا ہے اور ذلّت اور مسکنت اس قوم کا مقدر ہو جاتی ہے۔ یہی مشیّتِ الٰہی ہے۔ یہی قانونِ فطرت ہے اور یہی تاریخی حقیقت ہے کہ جو قوم ظلم کے سامنے سینہ سپر ہونے سے انکار کر دیتی ہے وہ تباہ و برباد ہوتی ہے۔ آج نہیں تو کل۔ ممکن ہے اس کی ایک نسل اس تباہی و بربادی کا نظارہ نہ کر سکے لیکن آنے والی نسل ضرور اس کا نظارہ کرتی ہے اس لیے کہ قوموں کی زندگی میں ماہ و سال کی پیمائش کا معیار اور ہے۔ یہ ہے تاریخ کا وُہ سب سے اہم سبق جو اس نے ہمیں دیا ہے۔

لہذا جو لوگ معاشرے کی اصلاح کے لیے اچھا کام کرنا چاہتے ہیں اور معاشرے میں تبدیلی لانے کے خواہشمند ہیں، انہیں چاہیے کہ وُہ تاریخ کا مطالعہ کریں، تاریخ کے اسباق پر تدّبر کریں۔ وُہ آیاتِ تاریخ سے سرسری طور پر نہ گزر جائیں اس لیے کہ انقلاب محض تخریبی کارروائیوں سے نہیں آتے، صرف توڑ پھوڑ سے نہیں آتے ہنگاموں اور تصادم سے بھی نہیں آتے اور محض نعرہ بازی بھی انقلاب لانے کا کوئی ذریعہ نہیں اس طرح اگر کوئی قوم، کوئی جماعت انقلاب لانے میں کامیاب بھی ہوتی ہے تو اس کی نوعیت محض عارضی، صرف ہنگامی اور سطحی رہی ہے۔ ایسے انقلابات پائیدار اور دیرپا نہیں ہوتے اور نہ معاشرے کی اصلاح میں ان سے کوئی مدد ملتی ہے۔ ایک مثبت اور معاشرے کے حق میں بہتر انقلاب لانے کے لیے بہت سے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس کے لیے بڑے غور و فکر کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے انقلاب لانے کی کوششوں میں کتنے نوجوانوں کے بال سفید ہو جاتے ہیں، تب کہیں جا کر ایک نئی فکری صبح طلوع ہوتی ہے۔ ہمارے نوجوانوں کو اسے اپنے لیے لمحۂ فکریہ بنانا چاہیے اور فکر و تدّبر کی ایسی قندیلیں روشن کرنی چاہئیں جن کا نور معاشرے کو تاریکیوں سے نکال کر ایک تازہ سحر کی جگمگاتی فضا میں لا بسائے۔ ہمیں تاریخ کے مختلف پہلوؤں، مختلف تہذیبوں کی تاریخ اور خاص طور پر اسلامی تاریخ کے عروج و زوال کے ادوار کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے تاکہ ہم دیکھ سکیں کہ ہم نے کیا اچھے کام کیے جن کے نتیجے میں عروج حاصل ہُوا اور کہاں لڑکھڑائے جس کی پاداش میں زوال کی پستیوں میں دھکیل دیے گئے اور ہم یہ دیکھ سکیں کہ آج ہم کس طرح عروج حاصل کر سکتے ہیں۔ وُہ کیا روّیۂ زندگی ہے جس کو اختیار کر کے ہم تباہی کے رُخ کو پھیر سکتے ہیں۔ یہی وہ سبق ہے جس کی طرف حکیم الاّمت نے نوجوان نسل کو توجہ دلائی تھی ؎

کبھی اے نوجواں مُسلم تدّبر بھی کیا تُو نے
وُہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہُوا تارا

ایک خُدا، ایک انسان

قرآنِ کریم کے پیش کردہ فلسفہ تاریخ کے بغائر مطالعہ سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ اسلام میں فرد کی حیثیت کائنات کے اس سارے نظام میں ایک بے مصرف پُرزے کی نہیں ہے۔ اس کے برخلاف مستشرقین اور مغربی فلسفیوں نے فرد اور سوسائٹی کے بُنیادی نظریہ میں ایک دُوسرے کے نظریہ سے بہت کم اختلاف کیا ہے اور سوسائٹی کو ایک جسم قرار دیتے ہُوئے فرد کی حیثیت کو اس جسم یا عضو کی اکائی سے زیادہ حیثیت نہیں دی۔ اُن کے نظریہ کے مطابق وُہ خلیہ یا اکائی وہی افعال انجام دیتی ہے جو عضو یا دُوسرے الفاظ میں سوسائٹی اس کے لیے متعین کرتی ہے۔ لیکن یہ نظریہ اسلام کے اس بنیادی نظریہ سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا جس میں انسان کو اس دنیا میں اپنے اعمال کے معاملہ میں خود مختار اور آزاد قرار دیا گیا ہے۔

سوسائٹی کو ایک جسمانی عضو قرار دے کر فرد کو اس کی اکائی ٹھہرانے کا یہ نظریہ پہلے سپنگلر نے پیش کیا تھا جسے تھوڑے بہت ردّ و بدل کے ساتھ ہیگل نے "ورلڈ سپرٹ" کے نام سے پیش کیا جس میں اس کے مطابق ورلڈ سپرٹ انسانی تاریخ سازی میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ کارل مارکس کے ہاں بھی فرد سوسائٹی کا جزو ہے اور اقتصادی طاقتوں کے زیرِ اثر ایک بے بس مہرہ سے زیادہ کچھ نہیں یہی اقتصادی عوامل و قوت اس کے نزدیک فرد کی قسمت بنانے یا بگاڑنے کی ذمہ دار ہے۔ کارل مارکس نے کہا ہے کہ

پیداوار کے مجموعی عوامل ہی سوسائٹی کے اقتصادی ڈھانچہ کو مرتّب کرتے ہیں، جو سوسائٹی اور فرد کے لیے حقیقی بنیاد ہے۔ اس بنیاد پر قانون اور سیاسی ڈھانچہ استوار ہوتا ہے اس میں سماجی بیداری پروان چڑھ کر اپنا صحیح رُوپ دھارتی ہے۔ اس لحاظ سے مادّی زندگی میں اقتصادی طریقہ عمل ہی عام سماجی سیاسی اور ذہنی بیداری میں لہو کا کام دیتا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ فرد کی شخصیّت کی تعمیر میں انسانی ضمیر یا بیداری کا کوئی حِصّہ نہیں بلکہ اس کی سماجی شخصیّت ہی اس کے وجود و عدم کو متعین کرتی ہے۔ اس لحاظ سے انسان کی حیثیت سوسائٹی میں مساوی قوّت کے زیر اثر ایک پُرزے سے زیادہ کچھ نہیں رہ جاتی۔

لیکن فرد کا سوسائٹی میں بے جان کھلونا بن جانا ساری دُنیا کے ادیان کی تعلیمات کے بھی صریحاً خلاف ہے۔ اس کی نشاندہی اس دَور کے مشہور مستشرق و تاریخ دان آرنلڈ ٹوین بی نے اپنی کتاب "سویلائزیشن آن ٹرائل" میں ان الفاظ میں کی ہے:

> یہ نظریہ کہ فرد سوسائٹی کے لیے زندہ رہتا ہے نہ کہ سوسائٹی فرد کیلئے اس لیے انسانی زندگی میں روحانی ترقی کی کوئی اہمیت نہیں بلکہ معاشرے میں مختلف سماجی اداروں کی ترقی زیادہ اہمیّت کی حامل ہے، صحیح نہیں ہے اور اگر اسے صحیح تسلیم کر کے عمل کی کسوٹی پر پرکھا جائے تو اس میں کئی کمزوریاں اور بُرائیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ ٹوین بی نے کہا ہے کہ یہ تصوّر کہ فرد سماج کا ایک بے جان جزو ہے کیڑے مکوڑوں، مکھیوں چیونٹیوں اور دیمک وغیرہ جیسے سماجی جانداروں کے لیے تو صحیح ہو سکتا ہے، لیکن ایسے کسی انسان پر یہ مثال صادق نہیں آسکتی جو ہمارے علم و ادراک میں ہو۔[1]

---

[1] سویلائزیشن آن ٹرائل صفحہ نمبر ۵۶-۲۵۴

مذہبی نقطۂ نظر سے بھی فرد کا سوسائٹی کے ساتھ اس طرح کا تعلق رُوح اور خُدا کے درمیان انسانی تعلق کی نفی ہے جس میں خُدا کی پرستش کا تصوّر نمایاں ہے نہ کہ کسی انسانی جماعت کی پرستش کا تصوّر۔

اسلام کا نظریہ اس موضوع کے متعلق بالکل واضح ہے کہ اسلام انسان کو اشرف المخلوقات قرار دے کر اسے زمین پر خُدا کا نائب یا خلیفہ گردانتا ہے اور اس کا کہنا ہے کہ اس کائنات میں جتنی چیزیں پیدا کی گئی ہیں وُہ انسان کے لیے مسخر کر دی گئی ہیں۔ وُہ تمام اس کے ماتحت اور تابع فرمان بنا دی گئی ہیں۔

سوسائٹی میں فرد کی حیثیت کے تعین کے بعد اسلام کا تاریخی طرزِ عمل ایک انتخابی طرزِ عمل بن جاتا ہے۔ انتخابی طرزِ عمل اس معنی میں کہ وُہ ایسے افراد کو جو دُنیا میں تہذیب و تمدّن اور کلچر کو اخلاقی اور رُوحانی اقدار کے مطابق پروان چڑھانے میں تن من دھن کی بازی لگا سکتے ہیں ان افراد کے مقابلے میں آگے بڑھانے میں معاون ہوتا ہے جو ان اوصاف کے حامل نہیں یہی طرزِ عمل ان اقدار کی حفاظت کرتا ہے جو انسان کے لیے کوئی قدر و منزلت رکھتے ہیں ورنہ فنا ہو جاتے ہیں۔

اسلام نے اس سلسلہ میں تاریخ سازی کے افادی نظریہ سے بھی اتفاق نہیں کیا جو بعض مغربی مؤرخین پیش کرتے ہیں کیونکہ بعض اعمال کسی جماعت یا سوسائٹی کے لیے بظاہر فوری افادیت کے اور ان کے لیے بہتر نظر آتے ہیں لیکن آخر کار اس کے اثرات ساری انسانیت کے لیے مضرت رساں ہو سکتے ہیں۔

تاریخ کے اسی نظریہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسلام نے ان وجوہ کی نشاندہی کی ہے جو اقوامِ عالم اور عالمی برادری کی بہتری کے لیے مشترک اساس بن سکتے ہیں قرآنِ پاک میں جگہ جگہ ایسی علامات اور نشانیاں بتائی گئی ہیں جو دُنیا میں انسانیت اور قوموں کے عروج و زوال کی نشاندہی کرتی ہیں اور جن پر غور و فکر اور بہتر

عمل درآمد سے کسی قوم کے بہتر انجام اور قسمت آوری کی وعید نکالی جاسکتی ہے۔
قرآن میں پیش کردہ وجوہات کا مختصر جائزہ یہ ہے۔

۱۔ مادّی طاقت وخوشحالی جب خود رائی کے وصف سے متصف ہوکر خُدائی احکامات کی تابعداری میں انکساری وعاجزی سے محروم ہوجائے۔

۲۔ تجارتی بددیانتی اور لین دین میں بے ایمانی۔

۳۔ تقویٰ یعنی پرہیزگاری کے مثبت تصوّر سے محرومی۔حق کی راہ اختیار نہ کرنا اور دُوسروں کو برائی سے روکنے کی کوشش بھی نہ کرنا۔

۴۔ بے ایمان اور بداخلاق لیڈرشپ کا اُبھرنا اور عوام کا بلاچون وچرا انہیں تسلیم کرلینا۔

۵۔ ناانصافی اور ظلم وزبردستی کا دور دورہ۔

یہ تمام باتیں کرۂ ارض پر تخلیقِ آدم کے اسلامی تصوّر سے مطابقت نہیں رکھتیں۔اسلام اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ انسان کو اپنی قسمت بنانے پر کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔اس کے برخلاف اسلام کا تصوّر یہ ہے کہ خُدا نے انسان کو زمین پر اپنا خلیفہ یا نائب بنایا ہے خُدا کے نائب کی حیثیت میں اسے فکروعمل کی آزادی دی ہے وُہ اس آزادی کے حدود میں رہتے ہُوئے اپنی دُنیا وعقبیٰ اور ماضی وحال سنوارنے یا بگاڑنے پر قادر ہے۔قرآنِ پاک میں یہ بات بڑی وضاحت سے پیش کی گئی ہے کہ ساری کائنات میں جتنی چیزیں پیدا کی گئی ہیں انہیں خُداوندِ قدوس نے انسان کا مطیع وفرمانبردار بنادیا ہے۔اوران تمام پر انسان کو فضیلت دی ہے اس نقطہ نظر سے بھی یہ بات غیرمنطقی اور خلافِ عقل معلوم ہوتی ہے کہ اس خُدا نے جس نے ساری کائنات کو انسان کے تابع فرمان کردیا ہے اسے اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی بہتری کے لیے کوئی اقدام کرنے کے اختیارات حاصل نہیں ہیں اس

کے علاوہ خُدا وند تعالیٰ نے اُسے دُوسری مخلوقات کے مقابلہ میں عقل جیسی نعمت عطا کی ہے جو اس کی سماجی اور دُوسرے دُنیوی اعمال میں صحیح رہبری کر سکتی ہے۔

عالمی حکومت

جدید سائنسی تحقیقات اور روز بروز کی ایجادات اور ٹیکنیکل ترقی اور تیز رفتاری نے رسل و رسائل کی نئی راہیں کھول دی ہیں اور مختلف ممالک اور اقوام کے درمیان جغرافیائی حدود اور فاصلے تنگ ہو گئے ہیں اور دُنیا سکڑ کر ایک دُوسرے کے قریب آتی جا رہی ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہُوا ہے کہ انسانیت بجائے علیٰحدہ ہونے کے بحیثیتِ مجموعی مربوط ہونے کے عمل سے دوچار ہے۔ اب جغرافیائی حد بندیاں ٹوٹ چکی ہیں۔ فاصلے سکڑ گئے ہیں اور مختلف ممالک کے اور اقوام کے افراد کا میل ملاپ بڑھ رہا ہے جس نے ان میں نہ صرف جسمانی اتحاد بلکہ فکر و نظر میں بھی یکسانیت پیدا کر دی ہے۔ اس سے اقوامِ عالم کے طرزِ فکر اور سوچ میں بھی تبدیلی آتی جا رہی ہے۔ ساری دُنیا کو امن کا گہوارہ بنانے کے لیے سب کے درد اور تکلیف کی ٹیس ایک سی محسوس ہونے لگی ہے یہی حالات ہیں جس نے موجُودہ دور کے بُلند مرتبہ فلسفی برٹرنڈ رسل اور مشہور تاریخ دان آرنلڈ ٹوین بی کو بھی عالمی حکومت کی وکالت میں لب کشائی پر مجبور کیا ہے۔ جس میں انہوں نے جبر استبداد بے ایمانی اور دُوسروں پر دھونس جما کر حکومت کے نظریہ کی جگہ راستی اور عقیدہ و ایمان کی بنیاد پر عالمی حکومت کے نظریہ کو اپنانے پر زور دیا ہے۔ آرنلڈ ٹوین بی نے اس موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہُوئے کہا ہے کہ

دُنیا اب سنجیدگی سے ایک ایسی عالمی حکومت کے قیام پر غور کر رہی ہے جو باہمی خیر خواہی اور معاہدات کے ذریعے عالم وجُود میں لائی جائے۔ جس میں زبان، تہذیب و تمدّن اور طرزِ زندگی کی یکسانیت اتحاد کی اساس ہو اور اُمید

ہے کہ کوئی بین الاقوامی تنظیم یا ادارہ ایسی حکومت کے قیام کی بنیاد بن سکے گا۔ یہ عالمی حکومت جو مختلف اقوام کے وفاق کی شکل ہوگی مختلف اقوام کے لیے اخلاق و عادات، بنیادی حقوق، طرزِ زندگی اور مشاغل کی یکسانیت کا ایک جامع معیار مرتب کرکے امن وامان اور بنیادی حقوق کے لیے عالمی حکومت قائم کرسکے گی[1]

جس بین الاقوامی اتحاد کی وکالت آرنلڈ ٹوین بی نے کی ہے وہ اس وقت تک قابلِ عمل نہیں ہوسکتا جب تک مشترکہ طرزِ زندگی کی گتھی کو سلجھا نہ لیا جائے کیونکہ ایسی کسی عالمی حکومت کا وفاقی ڈھانچہ مرتب بھی کر لیا جائے تب بھی اس کا فائدہ اس وقت تک کائناتِ انسانی کو نہیں پہنچ سکتا جب تک ساری عالمی برادری کی قلبی کیفیات اور خیالات میں تبدیلی لاکر انہیں رُوحانی طور پر مجتمع نہ کر دیا جائے۔

اسی مسئلہ پر دورِ جدید کے ایک اور فلاسفر پیری نے اپنی کتاب "ریلم آف ویلیو" کے صفحہ نمبر ۹۲ - ۴۹۱ پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"اگر دُنیا میں رُوحانی اور دلی اتحاد کی بنیاد پر کوئی عالمی حکومت معرضِ وجود میں آتی ہے تو اس کے دوام کی اُمید کی جاسکتی ہے اور اس سے انسانیت اور بنی نوع انسان کو فائدہ بھی پہنچ سکتا ہے لیکن اگر ایسے کسی اتحاد کے بغیر اُسے نافذ کر دیا گیا تو وُہ نہ صرف کمزور ہوگی بلکہ طویل العمر اور دیرپا نہیں ہوسکتی۔ اس لحاظ سے ایسی حکومت کے قیام کے لیے مشترک مذہب ایک لازمہ بن جاتا ہے۔ اس دور میں حقیقی سچائی صرف ایک ہی ہے اور اس میں دو رائے نہیں ہوسکتیں کہ انسان عقلِ سلیم کو استعمال کرکے اس مذہب کی کھوج لگائے اور ساری دُنیا اس سچے مذہب کی پیروی کرے"[2]

مغربی فلسفیوں کے مندرجہ بالا خیالات کی روشنی میں اگر اس بات کا جائزہ

۱- پراسپکٹس آف ورلڈ گورنمنٹ ص ۱ ۲- ریلم آف ویلیو - پیری، ص ۹۲ - ۴۹۱

لیا جائے کہ اسلام کس حد تک عالمی مذہب کی ضروریات اور معیار پر پورا اترتا ہے تو سب سے پہلی بات جو پیش کی جاتی ہے وُہ یہ ہے کہ اسلام بنیادی طور پر عالمی انسانی اتحاد کا داعی ہے۔ اسلام میں انسان کو ساری کائنات میں ارفع و اعلیٰ مقام دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں پہلے روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ قرآن کے مطابق اللہ تعالےٰ نے انسان کو "احسن تقویم" میں تخلیق فرمایا اور اُسے کرۂ ارض پر اپنا نائب اور خلیفہ مقرر کیا۔

وحدانیت

اسلام کے مطابق کوئی شخص اس وقت تک مُسلمان نہیں ہو سکتا جب تک وُہ زبان و دِل سے اس بات کا اقرار نہ کرے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور اللہ ہی کُل کائنات کا پیدا کرنے والا ہے۔ ایک خُدا کا اعتقاد یا توحید پر ایمان کا تصوّر ہی ایک عالمگیر اپیل رکھتا ہے جو دُنیا میں رُوحانی اتحاد کی طرف رہنمائی کر سکتا ہے۔

اس کے علاوہ قرآنِ کریم انبیاء سابقہ، انکی کتابوں، ان کے صحیفوں پر ایمان کو لازمی قرار دیتا ہے۔ تمام انبیاء کرام جو مختلف زمانوں میں خُدا کا پیغام لے کر مختلف اقوام میں پیدا ہُوئے وُہ برحق ہیں اور الہامی کتب کے ماننے والے تمام مذہب اور اُن کے انبیاء کی دعوت اور ان کے پیغام و تعلیمات کو اسی الہامی تحریک کا ایک حصّہ سمجھتا ہے جو ابتدائے آفرینش سے خُداوندِ قدوس نے انسان کی ہدایت کے لیے جاری کی۔ اسلام ان تمام الہامی مذاہب کا نکتۂ آخریں ہے اور انہی تعلیمات کو وُہ اپنی کامل و اکمل صورت میں پیش کرتا ہے۔ اس لحاظ سے خُدا کا یہ پیغام سارے عالم انسانیت کے لیے وحدانیت کا پیغام ہے جو ہر زمانے میں مختلف پیغمبروں نے پیش کیا اور کسی مخصوص طبقہ، وقت یا کسی مخصوص علاقہ و ملک سے متعلق نہیں ہے۔ بلکہ اس پیغام کی مخاطب ساری دُنیا اور عالمی برادری ہے یقیناً اس تخاطب میں عمومی اور عالمگیر اپیل موجود ہے اور اس کو اساس بنا کر اس سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

اتحاد و مُساوات

اسلام کہتا ہے کہ انسانی تخلیق کا سلسلہ نفسِ واحد سے شروع ہوا۔ اس لحاظ سے تمام افرادِ نوعِ انسانی آدم کی اولاد ہونے کی حیثیت سے بُنیادی طور پر ایک گروپ ہیں۔ جسے قرآن نے "اُمّۃ" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے جو موجُودہ دور میں استعمال ہونے والی اصطلاح میں نیشن یا قوم بھی کہی جا سکتی ہے۔ اس کے بعد کی تقسیم جو انسانوں نے اپنے درمیان کر لی ہے وُہ غیر فطری اور خُدا کی منشاء و مشیّت کے خلاف ہے۔ قرآن کہتا ہے

"اور تمام آدمی ایک ہی طریقے کے تھے پھر اپنی کجرائی سے انہوں نے اختلاف پیدا کر لیا اگر یہ بات نہ ہوتی جو آپ کے رب کی طرف سے پہلے ٹھہر چکی ہے تو جس چیز میں یہ لوگ اختلافات کر رہے ہیں ان کا فیصلہ دُنیا ہی میں ہو چُکا ہوتا"۔ [1]

انسان کی پیدائش اور نسلِ انسانی کے اتحاد پر روشنی ڈالتے ہُوئے قرآن نے کائنات کی پیدائش میں مختلف چیزوں کے اتحاد کی طرف توجہ دلائی ہے اور کہا ہے کہ انسان اس بات پر غور کرے کہ کائنات میں زمین و آسمان کے درمیان جتنی چیزیں تخلیق کی گئی ہیں وُہ کس طرح ایک مربوط نظام میں جکڑی ہوئی ہیں اور اپنے اپنے حدود میں گردش میں ہیں۔ انہی مربوط اجرام کو ہم کائنات کا نام دیتے ہیں انسان یہ بھی غور نہیں کرتا کہ وُہ کس طرح اپنے خالق کے اشارہ پر رواں دواں ہے اس کی پوزیشن کائنات کے نقطۂ نظر سے ایسی ہی ہے جیسے رُوح کی انسانی جسم کے ساتھ ہے۔

آفاقی مذہب

ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآنِ پاک بنی نوع انسان کے اتحاد اور دین اسلام کی آفاقیت پر کافی زور دیتا رہا ہے اس شہادت سے ہم با طمینانِ تمام اس نتیجے

۱۔ قرآنِ حکیم سورۃ یونس۔ آیت ۱۶

پر پہنچ سکتے ہیں کہ اسلام ساری دُنیا کو ایک سمجھتا ہے اور قرآن پاک ایک نہایت مربوط، جامع اور مضبوط بنیاد فراہم کرتا ہے جس پر ایک نئے عالمی نظام کو استوار کیا جا سکتا ہے۔ اسلام نے جس انسانی وحدت اور سماجی اور سیاسی مساوات کا تصور پیش کیا ہے اس سے بہتر وضاحت ممکن نہیں۔ یہ خود غرضانہ مفادات جغرافیائی تقسیم، نسلی تفریق اور جماعتی امتیاز ان سب کو مٹا دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی بیداری اور اسلام کی عظمتِ رفتہ کی بازیابی اور اس وقت دنیا میں جو ملحدانہ جماعتی امتیازات سے پُر ظالمانہ نظام کارفرما ہیں ان کے چنگل سے مظلوم و بے بس انسانیت کو نجات دلانے کا ہمہ وقت امکان ہے۔ مسلم اتحاد بنی نوع انسان کے اتحاد اور نجات کی طرف ایک مثبت قدم ثابت ہو سکتا ہے جس طرح کہ ٹائن بی جیسی شخصیت نے نشاندہی کی ہے "اتحادِ عالم اسلام خفتہ حالت میں ہے۔ تاہم ہمیں اس امکان کے لیے تیار رہنا چاہیے کہ اگر کبھی مغربی غلبے کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر کے مغرب کی مخالف قیادت کا نعرہ بلند کیا جائے تو یہ پھر نیند سے جاگ اُٹھے۔ یہ نعرہ اسلام کے عسکری جذبے کو بیدار کرنے کے سلسلہ میں لامحدود سیاسی اثرات پیدا کر سکتا ہے۔ خواہ اسلام اصحابِ کہف کی سی گہری نیند میں مبتلا کیوں نہ ہو۔ مگر کسی نہ کسی وقت اسلام کے پُرشکوہ دور کی بازگشت پھر سنائی دے سکتی ہے۔ ماضی میں دو تاریخی مواقع پر اسلام انسانی نجات کی علامت بن چکا ہے۔ ایک اس وقت مشرقی معاشرہ مغربی مداخلت کنندوں کے خلاف کامیابی سے اُٹھ کھڑا ہوا تھا جب پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ابتدائی جانشینوں (خلفائے راشدین) کے دور میں اسلام نے شام اور مصر کو تقریباً ایک ہزار سالہ یونانی غلامی کے دور سے آزاد کرایا تھا۔ اور دُوسرے اس وقت جب زنگی نورالدین، سلطان صلاح الدین ایوبی اور مملوکوں کے دور میں اسلام نے صلیبی جنگبازوں اور منگولوں کے حملے کی کامیاب

مدافعت کی۔ اگر دُنیا کی موجودہ صورتِ حال "نسلی جنگ" کو جنم دے تو پھر اسلام کو شاید دوبارہ اپنا تاریخی کردار ادا کرنا پڑے۔[1]

اسلام نے خُدائے پاک کی مرضی کے تابع انسانیت کے لیے عالمی حکومت کے قیام کا جو تصوّر پیش کیا ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات کے متعلق ان تمام غلط فہمیوں اور غلط نظریات کو دُور کیا جائے جو بعض مغربی باشندوں کے اذہان میں گہرے طور پر گھر کر چکے ہیں۔ ماضی میں کچھ ایسے مستشرق گزر چکے ہیں جو بغض و کینہ کے سبب سے نہیں بلکہ محض لاعلمی کے باعث اسلام کی مسخ شدہ تصویر پیش کرتے رہے ہیں۔ یہ ایک فالِ نیک ہے کہ بیسویں صدی کے دُوسرے نصف حِصّے میں مغربی دُنیا اسلام کو بہتر طور پر سمجھنے لگی ہے۔ موجودہ رجحان یہی ہے کہ بین الاقوامی ہم آہنگی کو ترقی دینے کے لیئے یہ ضروری ہے کہ اختلافات کا دائرہ تنگ کیا جائے اور جو اُمور باعثِ تصادم ہوں انہیں دُور کرنے کی کوشش کی جائے۔

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ جہالت یا لاعلمی کئی غلط نظریات کو جنم دیتی ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ دُنیا کے عوام اسلام کو اسطرح سمجھیں اور اسطرح اس کا مطالعہ کریں جس طرح قرآنِ پاک اسے پیش کرتا ہے۔ اس عالمگیر مذہب کو صحیح طور پر سمجھنے ہی میں عالمی امن کی بقا، انسانی معاشرہ کی تعمیر اور بین الاقوامی امن کا راز مضمر ہے۔

مُسلمانوں کا بھی اہم فرض ہے کہ وُہ فرقہ وارانہ نزاعات اور جغرافیائی حدبندیوں سے بالاتر ہو کر دُنیا کی موجودہ صُورتِ حال کے تناظر میں اسلام کو پیش کریں اور اس کی تبلیغ کریں۔ وقت کا تقاضا یہ ہے کہ انسانیت کے اس عظیم مذہب کے وُہ نکات واضح طور پر پیش کیے جائیں جن کی اپیل عالمگیر ہے اور جو امن و سکون کی تلاش میں بھٹکنے والی دُنیا کے مسائل کا حقیقی حل پیش کرتے ہیں۔

۱۔ ٹائن بی۔ سویلائزیشن آن ٹرائل۔ ص ۲۱۳

"مطالعۂ تاریخ"

پر

اخبارات و مشاہیر کی رائے

یہ چھوٹی سی کتاب ایک بہت بڑی حقیقت کی ترجمان ہے اور تحقیق و تدقیق کے لحاظ سے ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

تبصرہ : خاطر غزنوی ریڈیو پاکستان پشاور

۱۱- اکتوبر ۱۹۷۳ء

مولانا کوثر نیازی صاحب کا پیش کردہ یہ تحقیقی مقالہ حقیقی معنوں میں علمی اہمیت کا حامل ہے اور اسے دستاویزی حوالہ جات کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔

ترجمہ : روزنامہ "مارننگ نیوز" کراچی

۱۴- نومبر ۱۹۷۳ء

اس کتاب کا مرکزی خیال مغربی دُنیا کے ان دعووں کی قلعی کھولنا ہے کہ تاریخ جیسا کہ آج ہم اُسے سمجھتے ہیں، فن جدیدہ ہے اور یہ کہ تاریخ کی وُہ کتب جو محض دو سو سال پہلے لکھی گئی تھیں، کہانیوں اور افسانوں کے سوا کچھ نہیں۔

ترجمہ : روزنامہ "ڈان" کراچی

۱۸- نومبر ۱۹۷۳ء

اگر علمِ تاریخ کے طالب علم اور اس سے دلچسپی رکھنے والے دیگر افراد "مطالعۂ تاریخ" کا مطالعہ کریں تو اپنے وقت کو صحیح مصرف میں لائیں گے اور یہ کتاب اس موضوع پر ان کی معلومات میں بیش بہا اضافے کا باعث ہوگی۔

روزنامہ "امن" کراچی

۱۸- نومبر ۱۹۷۳ء

تاریخ جیسے وسیع و دقیق موضوع پر مولانا کوثر نیازی کی یہ تصنیف زبان کی سادگی، پیرایۂ بیان کی روانی اور مطالب کی وضاحت کے اعتبار سے بڑی قابلِ فہم ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس میں تاریخ کی افادیت پُوری طرح نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔

روزنامہ "امروز" لاہور

۲۵ - نومبر ۱۹۷۳ء

مولانا کوثر نیازی نے وزارت، سیاست اور خطابت کی اعصاب شکن مصروفیات کے دوران میں جو کتابیں لکھی ہیں ان میں سب سے چھوٹی "مطالعۂ تاریخ" ہے لیکن علمی تحقیق اور اس سے اُبھرنے والے خیال افروز نکات کے اعتبار سے سب پر بھاری ہے اور اس قابل ہے کہ پیشہ ور مؤرّخ اس کا مطالعہ کریں اور اساتذۂ تاریخ اس کی روشنی میں یونیورسٹیوں کے نصاب میں مناسب تبدیلیاں کریں اور جو نکات اُبھرے ہیں ان پر تحقیق کریں تاکہ علم کے لیے دروازے کھلیں اور ہم اس حصار سے باہر نکلیں جو یورپی مؤرخین نے ہمارے ارد گرد کھینچ رکھا ہے۔

تبصرہ : ڈاکٹر عبدالسّلام خورشید

روزنامہ "مشرق" لاہور، کراچی، کوئٹہ، پشاور

۲۵ - نومبر ۱۹۷۳ء

یہ کتاب اس لحاظ سے یقیناً ممتاز درجہ پر فائز کی جا سکتی ہے کہ اس میں اہلِ مغرب کے مسموم پروپیگنڈہ اور بے سروپا اتّہام کی منطقی انداز میں نفی کی گئی ہے۔ مولانا کوثر نیازی نے اسلامی محققین کے ناموں اور ان کی تصانیف کے حوالے سے انگریز مؤرخین پر واضح کر دیا ہے کہ قرآنِ کریم کے نزول کے وقت تاریخ کا علم وثوق کے درجے تک پہنچ چکا تھا۔

روزنامہ "جمہور" لاہور

۲۸ - نومبر ۱۹۷۳ء

مولانا کوثر نیازی کی یہ جامع تصنیف تاریخ کے مضمون سے دلچسپی رکھنے والے طلباء اور تحقیقی و علمی حلقوں کے لیے ایک نادر اور قیمتی کتاب کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کتاب کو شائع کر کے انہوں نے فی الحقیقت ایک تحقیقی اور علمی ضرورت کو پورا کیا ہے۔

ہفت روزہ "سیادت" بہاولپور
۳۰۔نومبر ۱۹۷۳ء

حقیقی معنوں میں یہ تاریخی ادب میں ایک اہم اضافہ ہے۔ یہ کتاب متجسس نگاہوں کو ایک اہم موضوع پر مزید تحقیق کی ترغیب دیتی ہے۔ اسے علمِ تاریخ کی ابتداء پر ایک مختصر مگر جامع تحقیقی مقالہ کہنا بے جا نہ ہوگا۔

تبصرہ : مظہر باری

ترجمہ : روزنامہ "سن" کراچی
۹۔دسمبر ۱۹۷۳ء

یہ کتاب بنی نوع انسان کے فکری ارتقاء سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک بے حد مفید اور دلچسپ دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

روزنامہ "حریت" کراچی
۱۰۔دسمبر ۱۹۷۳ء

مولانا کوثر نیازی

کی

ایمان افروز کتابیں

اسلام ہمارا دین

دینی، سیاسی، معاشی، معاشرتی، ثقافتی اور اخلاقی مسائل پر فکر انگیز مضامین۔ کئی نئے اضافوں کے ساتھ۔ قیمت:-/۳۰ روپے

بصیرت

کلام اللہ کی اُن آیات کی تشریح جو ہماری روزمرہ زندگی سے متعلق ہیں مختصر مگر جامع۔

قیمت:-/۲۰ روپے

بنیادی حقیقتیں

اسلام کے بنیادی حقائق مختصر الفاظ میں اس طرح پیش کیے گئے ہیں کہ کوئی تشنگی باقی نہیں رہتی۔ قیمت:-/۱۴ روپے

آئینہ تثلیث

مولانا نے اُن عیسائی مشنریوں کو آئینہ دکھایا ہے جو آدمیت کی نجات کے بہانے لوگوں کو گمراہی کے گڑھے میں دھکیلتے ہیں۔ قیمت:-/۱۴ روپے

تخلیق آدم

اِرتقاءِ انسانی کے بارے میں ڈارون کے نظریات کا ابطال قرآن و حدیث کی روشنی میں۔ قیمت:-/۱۴ روپے

اسلام ہمارا رہنما

اسلام ہمارا دین، بصیرت اور بنیادی حقیقتیں کے سلسلے کی ایک اہم کڑی، جو اسلامی تعلیمات پر بہترین موادِ مطالعہ پیش کرتی ہے۔ قیمت:-/۱۴ روپے

مطالعہ تاریخ

تدوینِ تاریخ کے بارے میں مغربی مؤرخین کے نظریات کا ابطال قرآن کے تصورِ تاریخ اور مسلمان مؤرخین کی تحقیقات کی روشنی میں۔ قیمت:-/۹ روپے

زرِ گل

مولانا کی نعتوں، نظموں اور غزلوں کا دلنواز مجموعہ۔ طباعت آفسٹ دو رنگا۔ متعدد اضافوں کے ساتھ۔ قیمت:-/۲۰ روپے

ذکرِ حسینؓ

شہادتِ حسینؓ پر تاریخ کے آئینہ میں ایک جامع اور مدلل کتاب۔

قیمت:-/۹/۵۰ روپے

اندازِ بیاں

مولانا کوثر نیازی کے ادبی، سیاسی، پارلیمانی اور عوامی خطبات کا ایک ضخیم مجموعہ۔ تاریخی تصاویر سے مزین۔ قیمت:-/۶۰ روپے

رہنمائے حج

ایک مکمل حج گائیڈ۔ اہم اور عملی دینی مسائل کے حل کے ساتھ جو آپ کو کسی اور کتاب میں نہیں ملیں گے۔

ایک ہفتہ چین میں

چین کے جغرافیائی اور تاریخی حالات کے علاوہ مصنف کے دورۂ چین کے شگفتہ تاثرات ادبی زبان میں۔

میلاد النبیؐ اور اس کے تقاضے

عید میلاد النبیؐ کی شرعی حیثیت اور اس کے جذباتی، نفسیاتی اور دینی تقاضے۔

اسلام کے معاشی تصورات

ایک خطبہ جو اپنے موضوع، مواد اور اسلوب کے اعتبار سے منفرد حیثیت رکھتا ہے۔

شیخ غلام علی اینڈ سنز، پبلشرز

لاہور ——— حیدرآباد ——— کراچی